سلسلہ ۱۲

ومن یتوکل علی اللہ فہو حسبہ

ناصبیت

تحقیق کے بھیس میں

محمود احمد عباسی کے تازہ اٹھائے
ہوئے فتنہ کا علمی اور تحقیقی جائزہ

از

محقق العصر مولانا محمد عبد الرشید نعمانی مدظلہ

ناشر

ڈاکٹر محمد عبد الرحمن غضنفر

مؤسس و مدیر

الرحیم اکیڈمی

اے ۱/۷، منظم نگر پوسٹ آفس لیاقت آباد کراچی ۱۹

قیمت : [illegible] روپے

ناصبیت تحقیق کے بھیس میں

از مؤرخ جلیل مولانا محمد عبد الرشید نعمانی مدظلہ

حافظ ابن حزم اندلسی المتوفی سنہ ۴۵۶ھ نے شہادتِ عثمانؓ، حادثۂ کربلا، واقعۂ حرہ، حصارِ کعبہ وقتل ابن زبیرؓ، ان چاروں جانگسل واقعات کو اسلام کے چار رخنوں سے تعبیر کیا ہے کیونکہ شہادتِ عثمانؓ سے مرکز کا احترام ختم ہوا اور خلافت کا رعب و داب اٹھ گیا۔ حادثۂ کربلا میں آلِ رسول کی عزت خاک میں ملی، واقعہ حرہ میں مدینۃ الرسول کی بے حرمتی ہوئی۔ قتلِ ابن زبیرؓ سے کعبہ کی عزت کو داغ لگا۔ غرض ان چاروں ہنگاموں میں ناحق کوشوں نے وہ قیامت برپا کی کہ پناہ بخدا! خلیفۃ الرسول، عترتِ پیغمبرؐ اور اصحابِ نبی سب کا بے دریغ خون بہایا اور حرمِ مدینہ، خانۂ کعبہ جملہ شعائرِ اسلام کی عظمت کا ذرہ برابر پاس و لحاظ نہیں کیا۔

ان چاروں حادثات کے بارے میں ناصبیوں کا موقف یہ ہے کہ وہ شہادتِ عثمانؓ کا ذمہ دار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قرار دیتے ہیں، اور حادثۂ کربلا کا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو، اور واقعہ حرہ کا ان صحابہ کو جنہوں نے یزید کی اطاعت سے انحراف کیا تھا اور حصارِ کعبہ کا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ادعاءِ خلافت کو۔ شیعہ مروانیہ کا ایمان و عقیدہ یہی ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد نہیں بلکہ خلافت کے غاصب تھے اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن زبیر اور وہ تمام صحابہ جو حادثۂ حرہ میں یزید اور عبدالملک بن مروان کے تیغِ ستم کے نشانہ بنے شہید نہیں بلکہ خلافت کے باغی تھے جو اپنی بغاوت کی پاداش میں کیفرِ کردار کو پہنچے۔ شیعہ مروانیہ کا یہ نظریہ مروانیوں کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوگیا تھا لیکن محمود احمد عباسی نے کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" لکھ کر اس مردہ کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے شائع ہونے سے ملک میں ایک تازہ فتنہ ناصبیت کا پیدا ہوگیا ہے جس سے اب تک ہند و پاک کی سرزمین یکسر پاک تھی، اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ملک کا اچھا خاصہ سنجیدہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس فتنہ کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا، اور اب تو بہت سے حلقوں میں اس کو عباسی صاحب کی ایک تاریخی ریسرچ کا درجہ حاصل ہے۔

یہ کتاب سرتاسر فریب، خداع، تلبیس اور کذب و افتراء کا مرقع ہے۔ اس تاریخی ریسرچ کے چار ماخذ ہیں:

(۱) مستشرقین کی تصریحات، جن کو مؤلف جابجا آزاد اور بے لاگ محققین کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور ہر باب میں ان کے اقوال کو قولِ فیصل سمجھتے ہیں۔

(۲) شیعہ مورخین جن کے کذب و افتراء کا جابجا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود مؤلف ہر جگہ ان سے اپنے مطلب کی بات (کہیں ان کی عبارات میں قطع و برید کرکے اور کہیں بغیر اس کے ہی) لے لیتے ہیں۔

(۳) بعض وہ مصنفین جن پر ناصبیت یا اہل بیت سے انحراف کا اتہام ہے۔

(۴) خود اپنی دماغی اپج، جس میں مؤلف بڑی دور دور کی کوڑی لاتے ہیں، اور ایسی ایسی بات اپنی دل سے گڑھتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران و ششدر رہ جائے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اہل سنت میں سے کسی محقق عالم کے قول کو اثباتِ مدعا کے لئے مولف نے اپنے اصلی رنگ میں پیش نہیں کیا، پھر تاریخی دیانت کا یہ عالم ہے کہ مولف کو کسی کتاب کا صریح غلط حوالہ دینے میں بھی ذرا باک نہیں۔ مثال کے طور پر کتاب خلافتِ معاویہ و یزید (ص ۴۹ طبع اول و دوم، و ص ۶۳ طبع سوم، و ص ۱۰۰ طبع چہارم) میں یزید کے بیان مناقب کے سلسلہ میں اس عربی عبارت کو نقل کرنے کے بعد وقد کان یزید فیہ خصال محمودۃ من الکرم والحلم والفصاحۃ والشعر والشجاعۃ الخ جو تاریخ الاسلام ذہبی ص ۹۳ ج ۳ کا حوالہ دیا گیا ہے محض غلط ہے۔

غرض اس کتاب میں اس تحقیق و ریسرچ کے نام پر جس طرح خداع و تلبیس سے کام لے کر ناصبیت کی داغ بیل ڈالی گئی ہے اس نے بہت سے لوگوں کو اس فتنے میں مبتلا کر دیا ہے۔ عباسی کے اس دجل و فریب پر اگر علم و تحقیق کی روشنی میں مطلع ہونا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ایک بار مطالعہ ضرور فرمائیے۔ ناشر

مکتبہ سلطان عالمگیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، ولا عدوان الا علی الظالمین والصلاۃ
والسلام علی رسولہ محمد سید الانبیاء والمرسلین، وعلی آلہ الطیبین
الطاہرین، واصحابہ الہداۃ المہتدین، وسائر اتباعہ اجمعین

اما بعد

ضبط کروں میں کب تک آہ — چل رے خامہ بسم اللہ

زمانے کا انقلاب بھی عجب شے ہے، ہزار برس کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں مسلمانوں کو کیسا عروج نصیب فرمایا تھا، انسانی زندگی کا وہ کونسا شعبہ تھا جس میں امتِ مسلمہ کو امامتِ اقوام کا منصب حاصل نہ تھا۔ دنیوی علوم وفنون کا تو ذکر ہی کیا اغیار کو اپنے دینی اور مذہبی علوم کے لئے بھی ہمارے ہی آستانہ کی جبہ سائی کرنی پڑتی تھی۔

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری — اول بشگون کرد طوافِ قفسِ ما

مشہور مورخ علامہ قاضی ابن خلکان اپنی کتاب وفیات الاعیان میں شیخ ابوالفتح موسیٰ بن یونس المتوفی ۶۳۹ھ کے ترجمہ میں جن کو دربارِ علم سے کمال الدین کا لقب عطا ہوا ہے یوں رقمطراز ہیں:-

وکان اھل الذمۃ یقرؤن علیہ التوراۃ والانجیل وشرح لہما ھذین الکتابین شرحا یعترفون انھم لا یجدون من یوضحھما لھم مثلہ

اور ذمی لوگ (یہود ونصاریٰ) ان سے تورات وانجیل پڑھا کرتے تھے موصوف نے ان دونوں فرقوں کی خاطر ان دونوں کتابوں کی ایسی شرح کی ہے جس کے بارے میں یہ لوگ معترف ہیں کہ ان کی طرح سے ان دونوں کتابوں کی شرح کرنے والا اپنے لئے ان کو نہیں ملتا۔

یہ فسانہ نہیں تاریخی حقائق ہیں، علامہ کمال الدین مذکور سے قاضی ابن خلکان کی بارہا ملاقات

ہوئی ہے۔ قاضی صاحب کے والد سے ان کے بڑے گہرے مراسم اور دوستانہ تعلقات تھے اس لئے قاضی صاحب موصوف نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے چشم دید لکھا ہے مگر

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے　　　یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

زمانے کو بدلتے دیر نہیں لگتی، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ　　　اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں۔

آخر تاریخ نے اپنا ورق اُلٹا، دنیا بدلی اور حالات دگرگوں ہوگئے، فاتح مفتوح ہوئے، مخدوم خادم بنے اور امام نے ماموم کی جگہ سنبھالی۔ اللہ اکبر! کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس قوم کے آسمانی علوم نے دوسروں کے آسمانی علوم کو منسوخ کردیا تھا اب وہ اس درجہ گر چکی ہے کہ نہ صرف دنیوی علوم میں غیروں کی محتاج ہے بلکہ خالص اپنے علوم ملیہ کی ریسرچ اور تحقیقات میں بھی دوسروں ہی کی دست نگر اور ان ہی کے خوان علم کی زلہ ربا ہے۔ آج آپ کی جامعات (یونی ورسٹیوں) میں اسلامی علوم کا وہ کونسا شعبہ ہے کہ جس کے صدر نے یورپ یا امریکہ کے کسی یہودی یا نصرانی مستشرق کے آگے زانوئے شاگردی تہ نہ کیا ہو یا وہ اپنی کسی علمی ریسرچ وتحقیقات میں ان مستشرقین کا مرہون منت نہ ہو۔ دوسروں کے علم وتحقیق سے فائدہ اٹھانا کوئی بری بات نہیں لیکن اپنے فکر و نظر کو مغضوبین وضالین (مستشرقین یہود ونصاریٰ) کے بالکلیہ تابع بنا دینا ایسا قبیح جرم ہے جو کسی طرح قابلِ معافی نہیں۔ مستشرقین کے یہ تلامذہ دینی اور علمی نقطۂ نظر سے اس قدر پس ماندہ ہیں کہ ان میں آزاد مطالعہ او تحقیقات کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں ان کی اکثریت اوّلاً تو اصل اسلامی ماخذوں سے بے بہرہ ہے اس لئے اس کی رسائی مستشرقین کی تصانیف سے آگے نہیں کہ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (یہی ان کا مبلغ علمی ہے) اور جو معدودے چند افراد ان میں عربی جانتے بھی ہیں تو انھیں علومِ اسلامیہ میں اتنی دستگاہ نہیں کہ کسی مسئلہ پر اصولی حیثیت سے نگاہ ڈال سکیں۔ پھر ان کی علمی تربیت چونکہ تمامتر ان ہی مستشرقین کے زیر نگرانی ہوتی ہے اس لئے ان کا اندازِ فکر بحث کے ہر مرحلہ میں وہی ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے اساتذہ سے سیکھا ہے۔ یہ بیچارے لکیر کے فقیر جن کے دل ودماغ طالب علمی کے زمانے ہی میں قدم قدم پر اپنے اساتذہ کی تحقیق وریسرچ سے

مرعوب ہو چکے ہوتے ہیں ان میں اتنی سکت کہاں کہ اسلام کے کسی علمی مسئلہ پر ایک اصولی اور متکلم کی حیثیت سے رائے دے سکیں۔

مستشرقین کا اثر ہماری نئی نسل پر

ان مستشرقین کے تلامذہ میں سب سے زیادہ نامی گرامی ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ہیں جن کی ریسرچ و تحقیق کا لوہا نہ صرف ہمارے ملک کے دکاترہ (پی۔ ایچ۔ ڈی صاحبان) بلکہ یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے مستشرق بھی مانتے ہیں[۱]۔ ڈاکٹر صاحب کی ریسرچ کا ایک خاص موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ بھی ہے مگر وہ جس انداز پر سوچتے اور لکھتے ہیں اس کو معلوم کرنے کے لئے ان کی مشہور کتاب "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی" کا مطالعہ کافی ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو عنوان "شادی خانہ آبادی" جس کے تحت وہ اس طرح خامہ فرسا ہیں[۵۲]

"ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح آنحضرت اور بی بی خدیجہ میں تعارف ہوا اور کس طرح "الامین" کی امانت "تاجرۂ مکہ" کے ہاں رسوخ و اعتماد کے بڑھانے اور روابط میں تقرب اور ملاقاتوں میں کثرت و موانست کے پیدا کرنے کا باعث بنی۔

ایک طرف اگرچہ چالیس سالہ عمر ہے لیکن مال و نعمت کی فراوانی نے صحت و حسن کو غیر معمولی طور پر برقرار رکھا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے دو مرتبہ شادی ہو گی کا گرم و سرد بھی چکھا جا چکا ہے۔ اور پہلے شوہر ابوہالہ تیمی سے ہند نامی لڑکا اور دوسرے شوہر عتیق بن عائذ مخزومی سے ہند نامی ہی لڑکی ہو چکی ہے، لڑکے کی عمر ممکن ہے اس وقت بارہ پندرہ سال کی اور لڑکی کی آٹھ دس سال کی ہو لیکن تمول و تنعم کے باوجود اعتدال و عفاف کی زندگی نے وہ رعنائی باقی رکھی تھی جس کے باعث چراغ حسن کے پروانوں کی کمی نہ تھی۔ ابن حبیب نے تو ایک روایت میں بی بی کی عمر (۲۸) سالہ ہی بیان کی ہے جو اگر صحیح ہے تو دل کے جذبات لطیف کی حساس کیفیت اور تاثر پذیری میں کمی نہیں ہوتی اضافہ ہی

---

[۱] عباسی صاحب نے بھی "خلافت معاویہ و یزید" میں موصوف کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ "زمانہ حال کے ہندی عالم اور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب" (ص ۱۲۷ طبع دوم و ص ۱۴۹ طبع سوم)

[۵۲] یہ واضح رہے کہ اس کتاب کی آنے والی عبارتوں کو ہم نے اپنے دل پر سخت جبر کرکے حوالۂ قلم کیا ہے ورنہ اگر یہ کتاب چھپ کر شائع نہ ہو جاتی تو ہم کبھی اپنے قلم کو اس خرافات و واہیات کی نقل سے آلودہ بھی نہ ہونے دیتے۔

ہوسکتا ہے (دیکھو کتاب المحبر بر موقع)۔

دوسری طرف ایک پچیس سالہ جوان ہے مست شباب مگر شرمیلا، عفاف ونکوکاری میں لاجواب، سیاہ پتلیاں سرخ ڈوریوں سے بھرا ہوا حدقہ، بڑی بڑی آنکھیں، چاند سا مکھڑا، گورا رنگ، گٹھا ہوا بدن، معتدل قد، لب ودندان تھے کہ (ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں) "یاقوت کی ڈبیہ" میں براق وآبدار موتی" کشادہ پیشانی، بڑا سر، کماندار بھوں جو ناک کے قریب ملے ہوئے، اس نگاہ کی تیزی سے خرمن ہائے دل کا کیا حال ہو جو ثریا کے جھرمٹ میں گیارہ ستارے گن سکتی، صراحی دار گردن، سینہ وشکم ہموار اور بالوں سے خالی، سر کے بال نہ سیدھے نہ گھنگروالے مگر کندھوں تک لٹیں چھوٹی ہوئیں، بھری ہوئی ہتھیلیاں، اور تلوے ایسے کہ ننگے پاؤں قدم رکھیں تو نشان پورا پڑتا، چوڑا سینہ، مضبوط بازو، پتلی پنڈلیاں، باریک ہموار لیکن درمیان سے ابھری ہوئی کمان کی طرح کی ناک، مسکراہٹ غضب کی، آواز چاندی کی گھنٹی کی طرح لوچدار، اور لہجہ اتنا صاف کہ الفاظ میں ایک ایک حرف پوری طرح ادا ہونے والا، پیاری پیاری گھنی داڑھی، اور پھر صفائی سنگھار کا خیال۔

اس سراپا کے ساتھ پھرتی بھی ہے، استغنا بھی، عقل وذہانت بھی ہے ملنساری بھی، غریب نوازی بھی ہے دلچسپی کی جگہ دائمی سنجیدگی بھی، اور اگر اس پر خدیجہ طاہرہ کے بجھے ہوئے چراغ آرزو میں پھر سے تیل آگیا اور دل ہاتھ سے چھوٹ گیا تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ ہونے والی "ام المومنین" نے جب تک ضبط ہو سکتا تھا ضبط کیا مگر دل کی آگ دماغ کی خشکی کو کتنے دن باقی رکھ سکتی، شروع میں کاروبار کے متعلق گفتگو اور مشورہ کے نام سے بلاوے بڑھتے گئے اور ساتھ ہی تحفے بھی اضافے پانے لگے، جن میں یقیناً[1] موسمی اور فصلی تازہ میوے اور دیگر سامان بھی ہوتا ہوگا، آخر بی بی سے نہ رہا گیا تو ایک دن اپنی ایک پرانی منہ چڑھی اور راز داں سہیلی نفیسہ سے شرماتے جھجکتے کہہ ہی دیا کہ کیا لگن اور تڑپ پیدا ہو گئی ہے[2]۔ نفیسہ کے متعلق طبری نے مولاۃ اور مولدہ لکھا ہے یعنی کسی غیر قوم کی لونڈی کے بطن سے مکے میں پیدا ہوئی تھی، اور سہیلی نے کاہنہ ہونا لکھا ہے

[1] اپنے قیاس کو ڈاکٹر صاحب یقین سے کم نہیں سمجھتے۔ [2] یہ کسی عربی عبارت کا ترجمہ نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے اپنے خیالات ہیں۔

جس سے ممکن ہے یہودی خون مراد ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر پیام رسانی کا کونسا ذریعہ ہو سکتا تھا، کسی شریف زادی کے مقابلہ میں ایک لونڈی زادی ہی آسانی سے ایک نوجوان سے مل سکتی اور بے تکلف گفتگو کر سکتی[1]۔ اور ممکن ہے بی بی خدیجہؓ سے میل جول کے باعث پہلے ہی وہ آنحضرتؐ سے نہ صرف متعارف ہو بلکہ بی بی خدیجہ کے معمولی پیام سلام بھی پہنچاتی رہی ہو۔

بہر حال نفیسہ ایک دن موقع سے آنحضرتؐ سے ملتی اور یہ ذکر چھیڑتی ہے کہ تمہاری عمر کافی ہو چلی ہے۔ تم اچھے خاندان کے ہو، تمہارے اخلاق و کردار کی دھوم ہے، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے اچھی سے اچھی لڑکیاں تمہیں آسانی سے مل سکتی ہیں۔ آپؐ نے معاشی عذر کیا کہ گھر چلانا مشکل ہے[2]، نفیسہ نے کہا کہ اگر کوئی لڑکی تمہیں ملے جو حسین بھی ہو، خوب مالدار بھی ہو، اعلیٰ گھرانے کی بھی ہو؟ استفسار پر بی بی خدیجہؓ کی نشان دہی کی گئی۔ اور یہ کہنے پر کہ "بھلا جس کا شہر میں ہر کوئی خواہاں ہے مجھ مفلس کو کیوں چاہنے لگی"؟[3] نفیسہ نے کہا کہ تم آمادہ ہو تو اسے آمادہ کر لینا میرا ذمہ۔ آنحضرتؐ سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسی ذمہ دارانہ اطمینان دہانی کوئی فرستادہ ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال آپؐ بی بی خدیجہؓ سے پھر ملے اور شرمائے ہوئے انداز میں کسی نہ کسی طرح اپنا عندیہ ظاہر کر دیا۔ وہاں کسے انکار تھا۔ بہر حال باقاعدہ پیام اور عقد کا انتظام ہو گیا۔

نکاح کا قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی چاہے کنواری ہو یا دو بچوں کی ماں اپنے بزرگانِ خاندان کی منظوری کی محتاج تھی۔ آنحضرتؐ تو اپنے چچاؤں کو لے کر لڑکی کے گھر پہنچے لیکن لڑکی کو ابھی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اپنے بزرگوں کو کہتی۔ غالباً وہ ڈرتی تھی کہ افلاس سے تعصب برتا جائیگا۔ بی بی خدیجہؓ کے باپ خویلد کا "حرب فجار" کے زمانے سے بھی کچھ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب چچا عمرو بن اسد سے اجازت لینی تھی۔ بی بی نے راز کو آخر تک راز رکھا۔ صرف نکاح کے دن ایک ضیافت کر کے جس میں گانے کی تھی، چچا کو بلوایا۔ اور کھلانے کے بعد خوب پلایا بھی۔ اور جب وہ نشے میں چور ہو گیا

[1] مگر جب کاروبار کے متعلق گفتگو اور مشورے کے نام سے بلاوے پہلے سے موجود تھے تو پھر اس کنیز کے ذریعہ پیام رسانی کی کیا حاجت تھی، کیا اسی امر کا اظہار روبرو نہیں ہو سکتا تھا۔

[2، 3] یہ بھی کسی عربی عبارت کا ترجمہ نہیں بلکہ اپنے خیالات کی ترجمانی ہے۔

تو بی بی نے چچا پر عبا و قبا بھی ڈال دی۔ اور "خلوق" یعنی زعفران ملا ہوا عطر بھی مل دیا۔ اور پھر آنحضرتؐ کو بلا بھیجا[1] اور کہا کہ اب اپنے چچا ابو طالب سے کہہ کر ابھی یہاں آ کر منگنی کریں۔ ابو طالب نے حسبِ رواج لڑکے کی تعریف کی اور کہا کہ "شرافت و نجابت اور فضل و عقل میں قریش کا کوئی نوجوان اس کی برابری نہیں کرتا۔ دولت بیشک کم ہے لیکن وہ ہے بھی تو ایک پرچھائیں۔ آج ہے تو کل زائل۔ اور ایک عاریت ہے، کبھی آئی، آئی تو واپس بھی چلی گئی اور پھر یہاں دونوں کو لگی ہوئی ہے۔ یہ اسے وہ اسے چاہتے ہیں اور اس سے بہتر کیا جوڑ ہو سکتا ہے"! عمرو بن اسد نے نشہ میں (اور ایک روایت میں بی بی کے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل نے) اس کی تائید کی کہ "بیشک محمدؐ ایک نر اونٹ ہے اور اتنا شریف کہ اسے بٹھانے کے لئے اس کی ناک پر ضرب مارنے کی ضرورت نہیں"[2] پھر ہر طرف مبارک سلامت کا غل ہوا اور پھر رفتہ رفتہ دعوتی کھا پی کر اور پی کھا کر رخصت ہو گئے۔

---

[1] ابھی ڈاکٹر صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اپنے چچاؤں کو لیکر لڑکی کے گھر پہنچے" پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا آپ کو بلا بھیجنا کیا معنی۔ [2] ڈاکٹر صاحب نے ترجمہ کیا کیا مکھی پر مکھی مار دی جس سے مطلب خبط ہو کر رہ گیا۔ خطبہ کے اصل الفاظ جو ایک نہایت ہی ضعیف روایت میں منقول ہیں یہ ہیں:-

هذا الفحل لا يقرع انفه — یہ وہ جوان مرد ہیں جن کی ناک پر ضرب نہیں لگائی جا سکتی (یعنی ان کی ناک نیچی نہیں کی جا سکتی)

علامہ طاہر پٹنی، مجمع البحار میں جو لغتِ حدیث کی مشہور ترین کتاب ہے اس کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

ای کریم کفوء لا یرد — یعنی یہ شریف اور کفو ہیں ان کی بات رد نہیں کی جا سکتی

"فحل" لغتِ عرب میں ہر نر حیوان کو کہتے ہیں اور جب انسان کے لئے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی جوان مرد کے آئیں گے "کریم کفو" اسی جوانمردی کا بیان ہے۔ "قرع الانف" یا "قدع الانف" کے معنی بیشک ناک پر مارنے کے آتے ہیں اور سرکش اونٹ کو بٹھانے کے لئے اس کی ناک پر ڈنڈا رسید کیا کرتے ہیں لیکن یہاں یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ "قرع الانف" ٹھیک اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے لئے ہم اردو میں "ناک نیچی کر دینا" بولتے ہیں اسی لئے علامہ پٹنی نے اس کی شرح لا یرد سے کی ہے یعنی ان کی بات رد کر کے ان کی ناک نیچی نہیں کی جا سکتی۔ ڈاکٹر صاحب نے اول تو "فحل" سے نر اونٹ مراد لیا اور پھر اس کے سارے لوازم ترجمہ میں ثابت کر دیئے جس طرح خود اس واقعہ کی تفصیلات میں انھوں نے کیا ہے کہ پہلے ذہن میں ایک نقشہ تیار کیا کہ عام حالات میں ایک چالیس سالہ عورت اور پچیس سالہ مرد کا نکاح کیونکر ہونا چاہئے اور پھر اسی نقشہ کے مطابق بلا امتیاز صحیح و غلط جو روایت جہاں سے ملی ٹانک دی اور پھر اس پر بیجا قیاسات کے اتنے پیوند لگائے کہ اصل واقعہ فسانہ میں گم ہو کر رہ گیا۔

لیکن باقاعدہ لڑکی کی رخصتی باقی تھی

غالباً شام کے قریب جب عمرو بن اسد ہوش میں آیا تو کہا یہ عطر اور یہ بخور اور یہ کپڑے جوڑے اور یہ گانا بجانا کیسا ہے؟ بھتیجی نے کہا "تم ہی نے تو معززین قریش کے سامنے میرا نکاح محمدؐ سے کیا" چچا سے کچھ مختصر سی تکرار ہوئی جس نے دھوکہ دہی کا الزام لگایا مگر جب اس نے دیکھا کہ نکاح کٹو سے ہوا ہے اور لڑکی تُلی ہوئی ہے تو اس نے بھی زیادہ انکار مناسب نہ سمجھا اور ہنسی خوشی محبت کی یہ تقریب تکمیل کو پہنچی"۔ (ص ۲۳، لغایت ص ۲۷، شائع کردہ "ادارہ اسلامیات" انارکلی، لاہور)

قطع نظر اس امر کے کہ اس میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط اور کتنا اصل واقعہ ہے اور کتنا زیب داستان کے لئے بڑھایا گیا ہے ہمیں تو سردست صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کیا ایک امتی اپنے پیغمبر کی تقریب نکاح کا واقعہ اسی شان سے بیان کیا کرتا ہے جس طرح ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تھے سادہ اور نیک دل مسلمان ہی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے سوچنے اور لکھنے کا انداز قطعاً مسلمانوں کا انداز نہیں ہے یہ تو پھر نکاح کا ایک معمولی واقعہ ہے ورنہ ان کی نظر میں تو نبی سے (العیاذ باللہ نقل کفر کفر نباشد) کفر اور بت پرستی کا صدور بھی عیب نہیں، چنانچہ اس بارے میں ان کی تحقیق انیق حسب ذیل ہے فرماتے ہیں:۔

"سیرت حلبیہ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابو طالب کے گھر والوں کی ایک بت پرستانہ عید میں حصہ لینے کے لئے آپ کو بہت برا بھلا کہہ کر مجبور کیا لیکن کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ ابو طالب نے پھر کبھی آپ کو اس پر مجبور نہیں کیا۔ کلبی کی کتاب الاصنام کا واقعہ بھی غالباً اسی موقع کا جزء ہے کہ آنحضرتؐ نے جاہلیت میں ایک بھوری بھیڑ قربانی دی تھی۔

اس کے بعد عالم نوجوانی میں چند واقعات ملتے ہیں جن سے

بالائے سرش ز ہوشمندی ۔۔۔ می تافت ستارۂ بلندی

تنبیہ ابھی اوپر سیرت حلبیہ کے حوالے سے قبائلِ اہلیت کی جس جاترا کا ذکر کیا گیا اس کی کچھ مزید تفصیل رسول اکرمؐ کی کھلائی بی بی ام ایمن کی ایک روایت میں ملتی ہے (جو اگرچہ واقدی کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے لیکن وہ قرین قیاس ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ واقدی کی یہ بات غلط ہی ہو) اور

وجہ یہ ہے کہ یہ بوانہ نامی بت کی سالانہ تقریب تھی، لوگ اس کی پوجا کے بعد سر منڈاتے تھے، جب وہاں جانے سے سال بسال آنحضرتؐ نے انکار کیا تو ایک سال ابو طالب بھی خفا ہوئے اور پھوپیاں بھی اور کہا کہ اپنی قوم کی عید میں شریک نہ ہونا اور مجمع کو بڑھانے میں حصہ نہ لینا بڑی بری بات ہے۔ اور پھوپیاں اتنی بضد ہوئیں کہ آنحضرتؐ بھی ساتھ جانے پر آمادہ ہوئے اور پھر غیبی حوادث پیش آئے وغیرہ، اور یہ سب نوعمری اور زمانۂ جاہلیت کا واقعہ ہے اور بفحوائے آیت مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲) کبھی نبی بننے سے پہلے پیش بھی آیا ہو تو ناممکن نہیں ہے"

(رسول اکرم کی سیاسی زندگی ص ۶۲ و ۶۳) سلہ

اللہ اللہ یہ جاترے کا دعوے (نعوذ باللہ) اس ذات گرامی کے متعلق ہے جس نے عالم میں توحید کا ڈنکا بجوایا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ثبوت میں پیش کیا جا رہا ہے کلبی اور واقدی کو اگرچہ واقدی کے بارے میں خود بھی دل میں دغدغہ ہے مگر اس کو یوں سمجھایا جا رہا ہے کہ "کوئی وجہ نہیں کہ واقدی کی ہر بات غلط ہی ہو" اور کلبی کے بارے میں تو ماشاء اللہ دل میں خطرہ تک نہ آیا، ریسرچ اسی کا نام ہے حالانکہ فن رجال کا معمولی سا عالم بھی اس بات سے ناواقف نہیں کہ کلبی اور واقدی دونوں مشہور دروغگو ہیں اور اسی لئے محدثین کے دربار میں ان کو بالکل بار نہیں بلکہ ان کے یہاں ان دونوں کو متروک الحدیث قرار دیا جا چکا ہے تاہم واقدی بہرحال کلبی سے بہتر ہے، واقدی سنی تھا اور کلبی پکا رافضی اور سبائی، واقدی نے صرف میلہ میں شرکت کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی بادل ناخواستہ کہ پھوپیاں بضد تھیں اور ابو طالب خفا ہو رہے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتوں سے کتنی نفرت تھی، مگر کلبی نے تو غضب ہی کر دیا بت کے لئے بھیڑ کی قربانی تک منسوب کر دی جو سراسر کذب و افترا ہے۔ کلبی نے کتاب الاصنام میں اس خرافات کو

سلہ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کی یہ ساری ریسرچ اپنی دانست میں مستشرقین کی تردید ہی کے لئے ہو، کیونکہ ان لال بجھکڑوں نے ایک مدت کی کاوش دماغی کے بعد یہ پہیلی بوجھی ہے کہ "ہو نہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعوائے نبوت (معاذ اللہ) اپنے ان تاثرات کا نتیجہ تھا جو شام وغیرہ کے سفر میں بحیرا راہب وغیرہ کی ملاقات یا ان سے تبادلۂ خیالات کی بدولت پیدا ہوئے تھے لہٰذا یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ نہیں نہیں وہ تو (العیاذ باللہ) بعثت سے قبل تک اپنے ان ہی خیالات پر تھے جو اہل جاہلیت کے تھے۔ مستشرقین تو وحی و نبوت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اس لئے اول فول بکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ایسا نہ چاہئے تھا۔

بلغنا کہہ کر ذکر کیا ہے یعنی "یہ بات ہم کو پہنچی ہے" اور اس کی سند سرے سے بیان ہی نہیں کی، خدا جانے کس مسخرے نے یہ بات اس سے کہی تھی جس کو اس نے "ابلہ گفت و دیوانہ باور کرد" کے اصول پر لکھ مارا۔ اغلب یہ ہے کہ خود اس نے یہ بات اپنے دل سے گڑھی ہو جس کا قرینہ یہ ہے کہ وہ خود سبائی تھا اور سبائیوں کے عقیدہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں۔ ممکن ہے یہ روایت اس نے محض اس لئے گھڑی ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق تو سب جانتے ہیں کہ وہ کبھی شرک سے ملوث نہ ہوئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ روایت بھی موجود ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ کلبی نے عزیٰ نامی دیوی کے متعلق اس قربانی کا ذکر کیا ہے مگر ڈاکٹر صاحب اسے بوانہ کے میلے کے ساتھ محض اپنے قیاس سے چسپاں کر رہے ہیں۔

یہ بحث تو روایت کے لحاظ سے ہوئی اور درایت کے اعتبار سے دیکھئے تو خود ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مکہ ایک تجارتی شہر تھا، شہر میں مالدار بھی تھے اور وقتاً فوقتاً ان کی خانگی تقریبیں شہر میں چہل پہل پیدا کرتی تھیں، ایک مرتبہ کسی ایسی ہی تقریب میں گانے بجانے کا بھی انتظام ہوا تھا، جو کسی قدر نادر موقع کہا جا سکتا ہے، آنحضرتؐ نے اپنے ایک ہمکار چرواہے لڑکے سے انتظام کیا کہ وہ ایک دن کے لئے دونوں گلوں کی رکھوالی کرے (یقیناً دوسرے مواقع پر آنحضرتؐ نے بھی اسی طرح ان رفقاء کا کام کیا ہوگا[1]) اور یہ کہ آپ شہر جا کر گانا سنیں، معلوم ہوتا ہے[2] کہ گرمی کے دن تھے اور جب آپ شہر پہنچے تو ابھی تقریب کو شروع ہونے میں دیر تھی۔ آپ تقریب گاہ سے باہر سائے میں انتظار میں بیٹھے تو غنودگی نے آنکھ لگ گئی اور جب بیدار ہوئے تو بعد از وقت تھا۔ اس قدرتی سزا کا آپ کے حساس اور غیور دل پر بڑا اثر ہوا، اور پھر کبھی اس طرح فرض کی نظر اندازی اور بے سود دل بہلائی سے جی نہ لگانے کا

---

[1] اگر اس سے مراد یہ ہے کہ رفقاء تو گانا سننے جاتے اور آپ ان کے گلوں کی رکھوالی کرتے تو یہ محض بے تکا قیاس ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہمیشہ یقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

[2] یہ واقعہ صحیح روایات میں موجود ہے جن میں اس کو رات کا واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے صرف یہ خیال کر کے کہ رات کو اونٹوں کی رکھوالی کس طرح ہو سکتی ہے رات کا دن بنا دیا ہے حالانکہ ناچ گانے کی محفلیں عموماً شب ہی میں ہوا کرتی ہیں تقریب نکاح کے بیان میں بھی ڈاکٹر صاحب نے خوب جی بھر کر قیاس آرائی کی ہے۔

عہد کرلیا۔" (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی۔ ص ۵۷ و ۵۸)

بھلا سوچنے کی بات ہے کہ گانا سننے سے تو حق تعالیٰ شانہ اپنے حبیب روحی فداہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حفاظت فرمائے اور بت پر قربانی کرنے سے نہ روکے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

اور یہ جو ڈاکٹر صاحب نے اپنی آنست میں قرآن پاک سے استنباط فرمایا ہے اور یوں دادِ تحقیق دی ہے کہ

"یہ سب نوعمری اور زمانۂ جاہلیت کا واقعہ ہے اور بفحوائے آیت مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲) کبھی نبی بننے سے پہلے پیش بھی آیا ہو تو ناممکن نہیں۔" (کتاب مذکور ۶۳)

صحیح نہیں کیونکہ آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ ایمانیہ کی یہ تفصیلات وحی آنے سے پہلے آپ کو معلوم نہ تھیں یہ نہیں کہ ایمانِ مجمل بھی آپ کو حاصل نہ تھا، یا معاذ اللہ آپ اس سے پہلے دولت ایمان ہی سے محروم تھے اگر یہ بات ہوتی تو غارِ حراء میں آپ کس کی عبادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور بچپن کے شق صدر سے کیا فائدہ ہوا اور پھر کافر آپ کو طعنہ نہ دیتے کہ کل تک تم جن کو پوجتے تھے آج ان کی مذمت کرتے ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں ایمانِ اجمالی کافی تھا چنانچہ زید بن عمرو بن نفیل کے لئے جو آپ کی بعثت سے پیشتر فوت ہو چکے تھے آپ نے اسی بنا پر نجات کی خبر دی ہے کہ ان کو ایمانِ اجمالی حاصل تھا

کلبی المتوفی سنہ ۲۰۴ھ اور واقدی المتوفی سنہ ۲۰۷ھ تو بعد کی پیداوار ہیں ان دونوں سے کہیں پیشتر امام ابو حنیفہ المتوفی سنہ ۱۵۰ھ اور محمد بن اسحاق المتوفی سنہ ۱۵۱ھ کی تصریحات اس بارے میں حسب ذیل ہیں، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

ومحمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حبیبہ	اور حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے حبیب اس کے
ورسولہ ونبیہ وصفیہ ونقیہ ولم یعبد	رسول اور نبی اور اس کے برگزیدہ و پاک کردہ ہیں آپ نے کبھی
الصنم ولم یشرک باللہ طرفۃ عین قط[1]	بت کی پوجا کی اور نہ ایک لمحہ کیلئے کبھی شرک کا ارتکاب کیا۔

اور محمد بن اسحاق کے الفاظ ہیں:-

فشب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیانے ہوئے تو حق تعالیٰ شانہ

[1] ملاحظہ ہو اشارات المرام من عبارات الامام از علامہ کمال الدین بیاضی ص ۳۲۳ تا ۳۲۵ طبع مصر سنہ ۱۳۶۸ھ

یکلؤہ اللہ ویحفظہ ویحوطہ من اقذار الجاھلیۃ ۔ ۱	جاہلیت کی ناپاکیوں سے آپ کی نگرانی اور حفاظت فرماتا رہا اور آپ کو ہر طرح بچاتا رہا۔

کون نہیں جانتا کہ امام ابو حنیفہؒ فقہ و کلام کے مشہور امام ہیں اور ابنِ اسحاق سیرت و مغازی کے، پھر ان دونوں ائمہ کی ان تصریحات کے ہوتے کلبی اور واقدی کے بیان کی کیا حقیقت ہے اور ان دونوں اماموں نے یہ بات اپنے جی سے نہیں کہی بلکہ بیہقی کی صحیح حدیث میں وارد ہے۔

قال زید فوالذی اکرمہ وانزل علیہ الکتاب ما استلم صنماً قط حتی اکرمہ اللہ تعالیٰ بالذی اکرمہ وانزل علیہ ۔	حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قسم اس ذات عالی کی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکرم فرمایا اور آپ پر کتاب نازل کی آپ نے کبھی کسی بت کی طرف رخ بھی نہیں کیا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو اعزاز بخشنا تھا بخشا اور آپ پر کتاب نازل کی۔

ابن اسحاق نے بحیرا راہب کے واقعہ میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عالمِ طفلی میں لات و عزیٰ کی قسم دیکر کچھ پوچھنا چاہا تو آپ نے اسے سختی سے منع فرما دیا کہ

لاتسألنی بھما فواللہ ما ابغضت شیئاً بغضھما ۔ ۲	ان کی قسم دے کر مجھ سے نہ پوچھو، اللہ کی قسم جیسی مجھ کو ان سے نفرت ہے کسی سے نہیں۔

یہ مستشرقین کے ارشدِ تلامذہ کا حال ہے باقی عام وکاترہ کا تو ذکر ہی کیا کہ

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

پھر ڈاکٹر صاحب تو اچھے خاصے متشرع مردِ مسلمان ہیں ورنہ زنادقہ اور ملاحدہ تو اسلام کو بالکل مسخ کر دینے پر تل گئے ہیں چنانچہ کہیں "ثقافتِ اسلامیہ" کے نام پر اسلامی تہذیب کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں اور کہیں "معارفِ قرآنی" کے پردہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو ناقابلِ اعتبار قرار دینے کی ناپاک مہم جاری ہے۔

---

۱ البدایہ والنہایہ از حافظ ابنِ کثیر ج ۲ ص ۲۸۶ طبع مصر ۱۳۵۱ھ ۔ ۲ ایضاً ج ۲ ص ۲۸۸۔

مستشرقین کی علمی مہم

حقیقت یہ ہے کہ پرستارانِ صلیب نے گذشتہ دوسو سال سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو ہتیار اٹھائے تھے وہ ابھی تک ہاتھ سے نہیں رکھے ہاں طریقِ جنگ، اسلحہ اور ان کا طریقِ استعمال حسبِ ضرورت موقع بموقع تبدیل ہوتا رہا۔ پہلے تسخیرِ ممالک کے لئے جنگ جاری تھی اس میں کامیاب ہوئے تو مفتوحین کے دل و دماغ کو مسخر کرنے کی فکر ہوئی سب سے پہلے پادری اس مہم کو سرانجام دینے کے لئے میدان میں آئے، انھوں نے منھ کی کھائی تو شاطرانِ یورپ نے تجربہ سے فائدہ اٹھاکر جنگ کا نقشہ بدل دیا، اب سامنے سے حملہ کرنے کی بجائے کمینگاہ سے حملہ ہوتا ہے اور اس سرعت و صفائی سے کہ ذہن مفلوج ہو جائے اور پتہ نہ چلے۔ اس حملہ کی کمان مدت ہوئی کہ پادریوں کی جگہ مستشرقین نے سنبھال لی ہے جو بڑے گرگ باراں دیدہ سرد وگرم عالم چشیدہ ہیں، ان کی گھاتیں بڑی زبردست ہوتی ہیں، چاہتے یہ ہیں کہ حریف اپنے زور میں آپ گرے ان کا مارا پانی نہیں مانگتا، انھوں نے ایک داؤ یہ چلا ہے کہ مختلف علومِ اسلامیہ پر ریسرچ کے نام سے بہت سی غیر متداول کتابیں جو ہر قسم کے رطب ویابس سے پُر تھیں اور عرصے سے گوشۂ گمنامی میں پڑی تھیں نہایت آب وتاب کے ساتھ طبع کراکر شائع کردی ہیں۔ بظاہر یہ ایک بڑی علمی خدمت ہے لیکن دراصل یہ ایک گہری سازش ہے جس کا اصل مقصد مسلمانوں میں ذہنی انتشار پیدا کرکے اس سے فائدہ اٹھانا اور انھیں اپنے نظریات کی طرف مائل کرنا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خود مسلمانوں کا قصور ہے انھوں نے ایسی کتابیں کیوں لکھیں لیکن دراصل ایسا نہیں ہر فن کی تدوین کے وقت اس کا تمام مواد یکجا کیا جاتا ہے کہ مبادا کوئی کام کی چیز رہ نہ جائے پھر سارے مواد کا مکمل جائزہ لے کر صحیح اور غلط کی الگ الگ نشاندہی کردی جاتی ہے مثلاً کسی زبان کی لغت کو اگر اول اول جمع کیا جائے گا تو اس کی صورت یہی ہوگی کہ شروع میں جتنے الفاظ مل سکیں گے انھیں یکجا کردیا جائے گا اور بعد کو تمام الفاظ کا جائزہ لے کر متروک ومتداول کی نشاندہی ہوگی، صحیح اور غلط کی تصریح کی جائے گی۔ فصیح وغیر فصیح کے باہم امتیاز ہوگا۔ اسلامی روایات کے بارے میں بھی یہی ہوا کہ شروع میں جو روایت جہاں سے ملی سپردِ قلم کردی گئی تاکہ تاریخِ اسلام کا کوئی واقعہ

قلبند ہونے سے رہ نہ جائے اور پھر اصولِ تنقید کی روسے ہر روایت کے متعلق وہ رائے قائم کرلی جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے اصولِ حدیث کا فن ایجاد ہوا، اسماء الرجال کی تدوین ہوئی فقہا نے استنباط کرتے وقت قانونی نقطۂ نگاہ سے ہر روایت کو پرکھا، متکلمین نے اصولِ عقلی پر جانچا محدثین نے اسناد و روایت کے لحاظ سے اس پر نظر ڈالی اور اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوگیا۔ لیکن سارے فنون مزاولت مشق اور ملکہ کے محتاج ہیں بغیر اس کے محض عربی زبان کے جان لینے سے کیا کام چلتا ہے، علوم اسلامیہ میں مہارت ہو تو کسی کتاب کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے اور اس کی روایت کو معیارِ نقد پر جانچنے میں ذرا دقت نہیں ورنہ جو ایک اردو خواں کی حیثیت اردو میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتی ہے وہی حیثیت ان عربی اسکالروں (پی۔ ایچ۔ ڈی صاحبان) کی ہے کہ وہ کلبی اور واقدی کا بیان بھی اسی طرح باور کرلیتے ہیں جس طرح امام بخاری و امام مسلم کا حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کی ان نئی شائع کردہ کتابوں کو ہمارے ان جدید اسکالروں کے ہاتھ میں دیکر انھیں ریسرچ کی دعوت دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کسی عطار کے ہاتھ میں دواؤں کو سپرد کرکے اسے یہ تلقین کرنا کہ بس اب تم طبیب بن گئے اس لئے علاج شروع کردو۔ یہ مستشرقین اگر ان کتابوں کی علمی حیثیت کو نہیں سمجھتے تو ان کی جہالت ہے اور اگر ان کی حیثیت کو جانتے بوجھتے انھیں متداول کتابوں کے برابر کئے دیتے ہیں تو پھر اس سے زیادہ کیا تفویت ہوگی۔

فان کنت لا تدری فتلك مصيبة　　　وان کنت تدری فالمصيبة اعظم[1]

غیر متداول کتابوں سے نقل صحیح نہیں

بہر حال ہمارے اسکالروں کی نظر میں ان تصنیفات کی چاہے کتنی ہی اہمیت اور وقعت کیوں نہ ہو لیکن اصولِ فن کی روشنی میں اول تو غیر متداول کتابوں سے نقل صحیح نہیں کہ ان میں الحاق کا امکان ہے اور پھر وہ بھی غیر مسلموں کی شائع کردہ ہوں تو پوچھنا ہی کیا کہ ہر مسلمان جانتا ہے "دینی امور میں غیر مسلم کی خبر کا کیا اعتبار" چنانچہ محدث ملا علی قاری، موضوعات کبیر

[1] اگر تجھے معلوم نہیں تو یہ ایک مصیبت ہے اور اگر معلوم بھی ہے تو پھر بھاری مصیبت ہے ۱۲

ہیں لکھتے ہیں :-

ومن القواعد الكلية ان نقل
الاحاديث النبوية والمسائل الفقهية
والتفاسير القرآنية لايجوز الا من
الكتب المتداولة لعدم الاعتماد على
غيرها من وضع الزنادقة والحاق
الملاحدة بخلاف الكتب المحفوظة
فان نسخها تكون صحيحة متعددة[1]

یہ بات قواعد کلیہ میں سے ہے کہ احادیث نبویہ، مسائل
فقہیہ اور تفاسیر قرآنیہ کا نقل کرنا صرف ان ہی کتابوں
سے جائز ہے جو متداول ہوں کیونکہ غیر متداول کتابوں
پر اعتماد نہیں کہ اس میں زنادقہ نے کچھ جعل کیا ہو یا
ملاحدہ نے الحاق کر دیا ہو۔ برخلاف کتب محفوظہ کے
کہ وہ صحیح ہوتی ہیں اور ان کے متعدد نسخے ہوتے ہیں
(لہٰذا ان میں جعل و الحاق نہیں ہو سکتا)۔

اور ہمارے شیخ الشیوخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ محدث دہلوی اپنی مشہور کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" میں رقمطراز ہیں :-

کتب مشہورۂ اہل سنت بجہت کمال شہرت
وکثرت نسخ قابل تحریف نیستند، وکتب
غیر مشہورہ را اعتبارے نیست، ولہٰذا محققین
اہل سنت از غیر کتب مشہورہ نقل را جائز ندا شتہ
اند مگر در ترغیب و ترہیب و در حکم صحائف
انبیای پیشین می شمارند کہ ہیچ عقیدہ و عمل را
ازاں اخذ نتواں کرد بجہت احتمال تحریف[2]

اہل سنت کی مشہور کتابیں تو کمال شہرت اور کثرت
نسخ کی بنا پر قابل تحریف نہیں ہیں اور کتب غیر مشہورہ
کا کوئی اعتبار نہیں یہی وجہ ہے کہ محققین اہل سنت
ان کتابوں سے جو مشہور نہیں بجز ترغیب و ترہیب کے
اور کسی چیز کا نقل کرنا جائز نہیں رکھتے وہ انھیں اگلے
پیغمبروں کے صحیفوں کا حکم دیتے ہیں کہ جن سے احتمال تحریف
کی وجہ سے کسی عقیدہ اور عمل کو نہیں لیا جا سکتا۔

شاہ صاحبؒ نے "ترغیب و ترہیب" کو اس لئے مستثنیٰ کیا کہ ترغیب یا ترہیب تو محض کسی حکم کی تائید کیلئے ہوتی ہے اور اصل حکم شرع میں پہلے سے ثابت ہوتا ہے۔ اس قاعدہ کلیہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اصول حدیث کی رو سے صحت خبر کی ایک ضروری شرط "ضبط" یعنی اس خبر کا پورے طور پر محفوظ

---

[1] ص ۸۷ طبع مجتبائی دہلی۔ [2] ص ۶۹ طبع مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۳۰۲ھ

کرنا بھی ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک ضبط صدر، دوسرے ضبط کتاب۔ "ضبط صدر" یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ دیکھا یا سنا وہ بیان کرتے وقت تک اس کے سینے میں محفوظ ہو، اور "ضبط کتاب" یہ ہے کہ جب سے راوی اسے ضبط تحریر میں لایا وقت روایت تک وہ تحریر ہر قسم کے الحاق و تزویر سے پاک رہے یہ قاعدہ ان کتابوں کے لئے ہے جو مسلمانوں کے پاس ہوں اور متداول نہ ہوں ورنہ جو کتابیں سرے سے مسلمانوں کے پاس ہی نہیں اور محض مستشرقین کی بدولت انھیں دیکھنا نصیب ہوا ان کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں آپ خود سمجھ لیجئے کہ اصول حدیث کے اعتبار سے ان کا کیا حکم ہونا چاہئے مستشرقین کے ان کتابوں کو شائع کر دینے کی وجہ سے اب اہل علم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اولاً ان کتابوں کی ان کے اصل مخطوطوں سے جو ہر قسم کے الحاق و تزویر سے پاک ہوں مراجعت کر کے دیکھیں کہ نقل مطابق اصل ہے یا نہیں اور جب اس کا اطمینان ہو جائے کہ واقعی طباعت میں خیانت نہیں کی گئی ہے تو پھر اصول نقد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے استفادہ کریں لیکن ہمارے ملک میں اہل علم جس کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اس کے ہوتے ان بے سروسامانوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھا سکیں گے یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے یا ان دریا دل امراء کا جو اس کام کی اہمیت سمجھیں اور اس کے لئے ایک علمی ادارہ کی تشکیل دیں جو مستند اور باخبر علماء کے زیر نگرانی اس کام کو انجام دے سکے جس کی بظاہر کوئی امید نہیں

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مستشرقین نے اسلامیات پر خود بھی بڑا زبردست لٹریچر تیار کر دیا ہے جس میں اسلامی نظریات اور اسلامی تاریخ کو بڑی بیدردی سے پامال کیا ہے ادھر عام مسلمان ایک عرصہ سے علوم اسلامیہ کی تحصیل کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور ہماری نئی تعلیمیافتہ نسل کو جو انگریزی ہی میں سب کچھ پڑھنا چاہتی ہے جب کسی بات کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ ان ہی مستشرقین کی تصانیف کی طرف رجوع کرتی ہے جن کی بے لاگ تحقیق و ریسرچ کا سکہ پہلے سے پہلے ہی ان لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوتا ہے، اس لئے بغیر کسی ادنیٰ مقاومت کے جو کچھ یہ کہہ دیتے ہیں دل ماننے کے لئے

تیار ہوجاتے ہیں اس طرح ان مستشرقین نے ہماری نئی نسل کو دینی اور علمی نقطۂ نظر سے جتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے صحیح معنیٰ میں اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

عباسی کی دریوزہ گری مستشرقین کے در پہ

حال کا تازہ ترین "فتنۂ ناصبیت" جس کی داغ بیل محمود احمد صاحب عباسی کے قلم نے خلافت معاویہ و یزید لکھ کر ڈالی ہے وہ تمام تر ان ہی مستشرقین کی زہر آلود معلومات پر مبنی ہے مؤلف نے ان معلومات کو ایک مدت کی ریسرچ کے بعد حاصل کیا جی جان سے انھیں قبول کیا اور اپنے دل و دماغ میں بسا لیا ہے۔ مستشرقین کی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرنے اور ان کے نظریات و افکار کو پوری طرح اپنے اندر ہضم کر لینے سے مؤلف کی نظریں اب اس درجہ خیرہ ہو چکی ہیں کہ ان کو ان مستشرقین کے علاوہ کوئی آزاد اور بے لاگ محقق ہی نظر نہیں آتا اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو بالکل ان ہی کے رنگ میں رنگ لیا ہے وہ بالکل ان ہی کی طرح سوچتے ان ہی کی طرح پڑھتے اور ان ہی کی طرح لکھتے ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال کا پس منظر یہ ہے کہ انھیں اپنے وطن امروہہ میں وہاں کے کٹر رافضیوں سے سابقہ پڑا، موصوف کو علوم اسلامیہ میں دسترس نہ تھی کہ اہل سنت کے جادۂ مستقیم پر قائم رہتے اور اعتدال کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے آخر جو ہونا تھا ہو کر رہا، مثالب صحابہ کی ناگوار بحث نے تاریخی مباحث کا دروازہ کھولا، روافض کے غلو، سب و شتم اور تبرا بازی کے مقابلے میں متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جواب ترکی بترکی کے جذبے نے ردعمل کی صورت اختیار کی جو اپنے حدود سے تجاوز کر کے ناصبیت میں تبدیل ہو گیا اب مؤلف اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کی مدد سے مایوسی تھی ناچار غیر مسلموں کو پکارا اور وہ مدد پر آموجود ہوئے۔ ڈوزی نے فوراً ڈور ہلائے۔ دے خوئے نے خوراک بہم پہنچائی اور حتّی نے ان کی حمایت کی، دوران تالیف میں ہر گام پر مؤلف ان ہی کی انگلی پکڑ کر چلے ہیں اور ان ہی کی حمایت و رہنمائی میں انھوں نے یہ منزل ہفت خواں طے کی ہے اور اس طرح جب بہزار وقت و خرابی ان آزاد اور بے لاگ مستشرقین کی مدد سے "ناصبیت کا یہ خوانِ لعنت" تیار ہو گیا تو بیچارے سادہ لوح عوام کی ضیافتِ طبع کے لئے اس کو شائع کر دیا۔ اگرچہ غالی رافضیوں کے مقابلے میں بیچارے عباسی

اب بھی طفلِ مکتب ہیں، تاہم اہلِ سنت کے نقطۂ نظر سے جو کچھ انھوں نے کیا بالکل غلط کیا۔ انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

اہلِ سنت کا شعار گالی کا جواب گالی نہیں ہے ان کی توصفت یہ ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (جب لغویات پر گذرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ نکل جاتے ہیں) اور وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (اور جب ان سے جاہل مخاطب ہونے لگتے ہیں تو یہ صاحب سلامت کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں) جس طرح ایک یہودی یا نصرانی کے مقابلے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طوفان باندھنے لگے ہم یہ نہیں کر سکتے کہ جذبات سے مشتعل ہو کر خدا نخواستہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام پر اعتراض کرنے لگ جائیں، اسی طرح سبِ صحابہ کا جواب اہلِ بیت کی حطِ مرتبت سے دینا کسی طرح ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔

ہاں اس حیثیت سے یہ بالکل نیا کارنامہ ہے کہ رفض کے تو مختلف مکاتبِ فکر یہاں پہلے سے موجود تھے مگر ناصبیت کا کوئی ترجمان نہ تھا لہٰذا انھوں نے اپنی دانست میں اس کتاب کو لکھ کر ایک بہت بڑی کمی کو پورا کر دیا۔ پھر جو کچھ کیا نہایت سلیقے سے کیا، رائی کا پربت، تل کا پہاڑ بنایا، حقیقت کو فسانہ، فسانہ کو حقیقت کر دکھایا اور یہ سب کچھ اس خوبصورتی کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والے کو حقیقت کا گمان ہونے لگے اور جو سادہ دل ایک دفعہ اس طلسم کی سیر کر لے پھر نہ نکل سکے مگر مؤلف نے جو بزم اس سر و سامان سے سجائی ہے اس کا تمام تر میٹر دساور سے آیا ہے جس کے بنانے اور تیار کرنے میں یورپ کے بہترین دماغوں نے ایک مدت تک اپنی ذہنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو صرف کیا ہے، جا بجا قیاسات بیجا کے پیوند لگائے ہیں حقائق تاریخی پر پردہ ڈالا ہے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کیا ہے تب کہیں جا کر یہ خاص الخاص انوکھے اور نادر معلومات وضع ہوئے ہیں ورنہ اسلام کے تاریخی خزانہ میں اس زرِ قلب کو کون پوچھتا ہے۔ تعجب نہ کیجئے "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے" خود مؤلف سے پوچھئے یہ مال مسالہ کس سے مستعار لیا ہے وہ آپ کو بتائیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن	دے خوئے نے اپنے مقالہ بعنوان "خلافت" میں . . . کہا ہے کہ:۔ "معاملہ فہم لوگوں نے اگرچہ وہ (حضرت) عثمانؓ کے طرز حکمرانی کی مذمت کرتے تھے مگر علیؓ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، گیارہواں ایڈیشن ج ۵ ص ۳۰) سلہ

(خلافت معاویہ و یزید طبع سوم ص ۶)

سلہ دے خوئے یا اس کا کوئی پرستار اگر اس جھوٹ کو سچ کر دکھلاتے اور مستند تاریخی حوالوں سے ان معاملہ فہم لوگوں کی نشاندھی کر دے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز حکمرانی کی مذمت کے ساتھ ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے تو یہ ایک تاریخی کارنامہ ہوگا مؤلف تو شاید یہ نہ کر سکیں کیونکہ ان کو یہ تسلیم ہے کہ

"تاریخ کی کھلی شہادت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تین خلافتیں متفق علیہ طور سے گذریں۔" (ص ۳۳۳ طبع دوم و ص ۲۶۰ طبع سوم)

اس لئے خود ان کی تحقیق و ریسرچ کے مطابق تو ان معاملہ فہم لوگوں کا سرے سے تاریخی وجود ہی نہیں کہ "تین خلافتیں متفق علیہ طور سے گذریں" پھر معاملہ فہم لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز حکمرانی کی مذمت کیسے کر سکتے تھے۔ یہ بھی ان ہی کے الفاظ ہیں کہ

"اس زمانہ کی برکات خلیفۂ سوم حضرت عثمان ذی النورینؓ کے عہد خلافت تک باقی رہیں (ص ۳۳۷ طبع دوم) اور نشو ونمائے ملت اسی منہاج پر جاری رہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معین فرمایا تھا۔

آنحضرتؐ برائے نشو ونمائے ملت اسلامیہ صورتے معین فرمودند کہ تا آخر عہد حضرت عثمانؓ متحقق شد (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۳۰)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت اسلامیہ کے نشو ونما کے لئے ایک صورت معین فرمائی تھی جو آخر عہد حضرت عثمانؓ تک یقیناً رہی۔ (خلافت معاویہ و یزید طبع سوم ۲۶۹)

ظاہر ہے کہ اس تصریح کے بعد اب دے خوئے کی اتباع میں ان لوگوں کو معاملہ فہم کہنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا جو "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز حکمرانی کی مذمت کرتے تھے"۔

یہ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ دے خوئے کی اس خرافات پر مؤلف نے بغض علیؓ کے جذبہ میں دھیان نہیں کیا۔ ان کا مقصود صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعن تھا اس میں ضمناً ایک بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی آگئی جو اگرچہ خود ان کے ضمیر کے بھی خلاف تھی مگر بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں وہ ایک "آزاد نگار مستشرق" کی زوردار شہادت تھی اس لئے وہ اس کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

مطاعن علی (رضی اللہ عنہ)

نااہلی، تقدس و پارسائی کا فقدان حصولِ اقتدار و حبِ جاہ	"دشمنانِ دین اور کفار سے تیغ آزمائی کرنے کی بجائے طلب وحصولِ خلافت کی غرض سے تلوار اٹھائی گئی تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

مقاتلات وے (علی) رضی اللہ عنہ برائے طلبِ خلافت بودنہ بجہتِ اسلام (ازالۃ الخفاج ۱ص ۲۷۷ سطر ۲۰)	علی رضی اللہ عنہ کی لڑائیاں (مقاتلات) تو (بعد شہادتِ عثمان) اپنی خلافت کی طلب وحصول کے لئے تھیں نہ باغراضِ اسلام۔ لہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مؤلف کی ساری کتاب ناصبیت کی آئینہ دار ہے خروج کی نہیں، خروج میں بغضِ علیؓ کے ساتھ بغضِ عثمانؓ بھی شامل ہے، بغضِ عثمانؓ پر خوارج وروافض دونوں کا اتفاق ہے، بغضِ علیؓ نواصب کی خصوصیت ہے اور بغضِ شیخینؓ روافض کی۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) لہ مؤلف نے احتیاط کے پیشِ نظر سطر تک کا یہاں حوالہ دیدیا ہے تاکہ کسی کو حوالہ کی صحت میں پس وپیش نہ ہو۔ بیشک مؤلف نے الفاظ کی نقل میں قطع وبرید سے کام نہیں لیا مگر بیانِ مطلب میں جو تحریف کی گئی ہے اس کا کیا علاج۔ شاہ صاحبؒ نے یہ جملہ اپنی کتاب میں اس مقام پر لکھا ہے جہاں اس آیت پر بحث کی ہے۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ (الفتح)	کہہ دیجئے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے آئندہ تم کو بلائیں گے ایک قوم پر بڑے سخت لڑنے والے تم اُن سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہوں گے۔

وہ فرماتے ہیں یہ آیت خلافتِ شیخینؓ کی دلیل ہے کہ "اولی بأس شدید" (سخت جنگجو لوگ یعنی فارس وروم) سے جنگ کی دعوت "اعرابِ حجاز" (بادیہ نشینانِ عرب) کو شیخین رضی اللہ عنہما ہی نے دی تھی نہ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کیونکہ ان کی جنگیں مطالبہ خلافت کی بنا پر تھیں نہ دعوتِ اسلام کی خاطر ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے میدان میں آتے تھے ان کے حریف کافر نہ تھے کہ جن کو دعوتِ اسلام دی جاتی۔ مؤلف نے اپنے پیش رو مستشرقین یہود ونصاریٰ کی اتباع میں جن کی خاص صفت ہے۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ	پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے۔

یہاں تحریفِ معنوی کی ہے اور عبارت کا مطلب بدل دیا ہے "نہ بجہتِ اسلام" کا ترجمہ ہے "نہ اسلام کی غرض سے" مؤلف نے غرض کی جمع اغراض لکھ کر ہر حیثیت سے "مقاتلاتِ علیؓ" کو اسلامی جنگوں میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

شاہ صاحبؒ کے اس خیال کی تائید ایک آزاد نگار مستشرق کے بیان سے ہوتی ہے۔ دے خوئے نے اپنے مقالہ بعنوان "خلافت" میں یہ لکھتے ہوئے کہ "بلوائیوں کے جم غفیر نے (حضرت) علیؓ کو زمام خلافت ہاتھ میں لے لینے کے لئے بلایا اور طلحہؓ و زبیرؓ کو ان کی بیعت کے لئے مجبور کیا" کہا ہے کہ :-

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شمار کرنے سے خارج کردیا ہے۔ حالانکہ شاہ صاحب ممدوح نے اس کتاب کی جلد اول کے خاتمہ پر مؤلف جیسے خوش فہم حضرات کو پہلے ہی تنبیہ کردی تھی کہ

غرضِ من آں نیست کہ حضرت مرتضیٰ خلیفہ نبود یا در حکمِ شرع خلافت او منعقد نگشت یا سعیِ او در حروبے کہ پیش آمد للہ فی اللہ نبود اعوذ باللہ من جمیع ما کرہ اللہ (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۳۳۵)	میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) خلیفہ نہ تھے یا حکم شرع میں ان کی خلافت منعقد نہ ہوئی، یا ان کی کوشش ان جنگوں میں جو انھیں پیش آئیں للہ فی اللہ نہ تھی، میں اللہ سے ایسی تمام باتوں سے پناہ مانگتا ہوں جو اس کو ناپسند ہوں۔

مؤلف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگوں کو محض دنیوی جنگ سمجھتے ہیں جو حصول اقتدار کے لئے لڑی گئی تھیں، لیکن شاہ صاحب موصوف اس بات کو زبان پر لانے سے بھی اللہ کی پناہ مانگ رہے ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے شاہ صاحب کا منشا اس جملہ سے جو مؤلف نے نقل کیا ہے صرف اتنا ہے کہ ان کی جنگیں اس آیت کے تحت نہیں آتیں کیونکہ ان کی لڑائی اسلام و کفر کی لڑائی نہیں بلکہ خلیفہ راشد کی باغیوں سے جنگ تھی۔ شاہ صاحب ممدوح کے نزدیک "مقاتلاتِ علیؓ" جس آیت کا مصداق ہیں وہ یہ ہے :-

وکریمہ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ منطبق است بر علی مرتضیٰ زیرا کہ در ایام خلافت او امرے کہ واقع شد و وے بداں متفرد بود قتالِ بغاۃ است۔ (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۳۱)	اور آیہ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (اور وہ لوگ کہ جب ان کو بغاوت کا سامنا ہوتا ہے تو وہ انتقام لے لیتے ہیں) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر منطبق ہے کیونکہ ان کے ایام خلافت میں جو خاص بات کہ واقع ہوئی اور جس میں وہ متفرد تھے وہ "قتال بغاۃ" ہی ہے۔

مؤلف کو چونکہ دے خوئے کی زبانی حضرت علی مرتضے کرم اللہ وجہہ پر طعن کرنا تھا اور شاہ صاحب کا حوالہ اس کے لئے بطور تمہید پیش کرنا اس لئے انھیں اس تحریف کے بغیر چارہ نہ تھا۔ ورنہ شاہ صاحبؒ کی جو قدر ان کے دل میں ہے وہ ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ

"شاہ صاحب اپنی جلالتِ قدر کے باوجود سبائی حضرات سے گلو خلاصی نہ پا سکے سیدنا معاویہ کے سوالیٰ ان کی سمجھ میں نہ آئے" (ص ۲۸۵ طبع سوم)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

"حقیقتِ نفس الامر یہ ہے کہ (حضرت) علیؓ کو (خلیفہ شہید کی) جانشینی کا استحقاق واقعاً حاصل نہ تھا علاوہ ازیں یہ بھی واضح ہے کہ تقدس وپارسائی کا جذبہ تو ان کے (طلبِ خلافت) میں کارفرما نہ تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بھلا جو شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں شاہ صاحب کی رائے کو حرفِ غلط سمجھتا ہو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی رائے کو کیا وقعت دے گا۔

مؤلف کی اس تصریح سے یہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کو مستشرقین کی جناب میں جس درجہ عقیدت ہے مسلمان علماء سے اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں۔ حد ہو گئی بے لاگ ریسرچ کی کہ دے خوئے تو آزاد نگار ٹھیرا اور شاہ ولی اللہ صاحب سبائی حضرات سے اپنی گلو خلاصی تک نہ کرا سکے۔ جب با ایں ہمہ اعترافِ جلالتِ قدر شاہ صاحب ممدوح کے متعلق مؤلف کی یہ رائے ہے تو اور کس عالم کو اب وہ آزاد نگار مان سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مؤلف نے اپنی ساری کتاب میں ایک جگہ بھی کسی مسلمان عالم کو آزاد اور بے لاگ محقق نہیں لکھا ہے غالباً ان کے نزدیک کوئی مسلمان آزاد نگار نہیں کہ یہ بات تو صرف مستشرقین ہی کا حصہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق اس ہرزہ سرائی کے باوجود جس معصومانہ انداز سے مؤلف اپنے آپ کو ان کی بدگوئی سے بری کرتے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے۔

"حضرت علیؓ عشرۂ مبشرہ میں ہیں سیاسی معاملات میں ان سے جو لغزشیں ہوئیں اس کے باوجود وہ ہمارے امام واجب الاحترام ہیں اور نسبی تعلق سے بھی ہمیں ان سے محبت ہے جو شخص بدگوئی کرتا ہے اس سے وہی کہوں گا جو میرے ایک دادا امیر عبداللہ المعتز عباسی (جو کہ حسب تصریح حافظ زین الدین عراقی ناصبی تھا۔ ملاحظہ ہو التقیید والایضاح ص ۲۶۷۔ نعمانی) نے ایسے ہی کسی بدگو کے جواب میں کہا تھا۔

زعمتَ بأنی یا مبغضُ مبغضٌ علیاً فما فخری اذاً فی المحافلِ

(اے دشمن تو مجھے علی کا دشمن بتاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کے سامنے میں کیا منہ دکھا سکتا۔)

أ أکلُ من لحمی واشربُ من دمی کذبت لحاك اللہ یا شر واغل

علیؓ کی برائی کرکے کیا میں اپنا ہی گوشت نوچ کھاؤں اور اپنا ہی خون پیوں۔ اے بدذات جھوٹے تجھ پر خدا کی مار)

علی وعباس یدان کلاهما یمین سواء فی العلی والفضائل

(علی وعباس دونوں یکساں ہیں۔ فضائل وشرافت میں اونچی چوٹی پر ہیں۔)

فهذا أبوهذا وهذا ابن ذا فهل بین هذین اتساع لداخل

(یہ عباس) ان کے باپ ہیں اور وہ (علی) ان کے بیٹے ہیں۔ سو ان دونوں کے درمیان تیسرے کا کیا دخل)۔

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

بلکہ حصولِ اقتدار و حبِ جاہ کی ترغیب تھی۔ اس لئے معاملہ فہم لوگوں نے اگرچہ وہ (حضرت) عثمانؓ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرتے تھے مگر علیؓ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا گیارہواں ایڈیشن ج ۵ ص ۲۰) (خلافتِ معاویہ و یزید طبع سوم ص ۶)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ستسمع مایخزیك فی كل محفل ‏ ‏ وتمسح رأس العارف المتغافل

(سوائے مخاطب تو جبر محفل میں ہمیں بدنام کرتا ہے اور تجاہلِ عارفانہ کرنے والے کو دھوکہ دیتا ہے عنقریب تجھے نتیجہ معلوم ہوگا)

(عرض مؤلف طبع سوئم ص ۳۳)

قربان جائیے اس ریسرچ کے جس میں عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی بزرگ کے لئے یہ کہدینا کہ

"حقیقت نفس الامریہ ہے کہ ان کو اپنے پیش روؤں کی جانشینی کا استحقاق واقعتاً حاصل نہ تھا اور تقویٰ پارسائی کا جذبہ تو ان کے طلبِ خلافت میں کارفرما نہ تھا بلکہ حصولِ اقتدار و حبِ جاہ کی ترغیب تھی اور معاملہ فہم لوگوں نے ان کو جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

بدگوئی نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ مؤلف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق جس امر کے مدعی ہیں روافض خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق وہی بات کہتے ہیں۔ مؤلف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی شہادت کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو (کہ یہی دو بزرگ عشرہ مبشرہ میں سے اس وقت زندہ موجود تھے) مستحقِ خلافت نہیں سمجھتے چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:۔

"اس زمانے میں عشرہ مبشرہ میں سے بعض حضرات، اصحاب بدر، اصحاب بیعت الرضوان اور دیگر صحابہ کرام کی کثیر تعداد بقید حیات تھی لیکن امت کو اختلال و انتشار سے نکالنے، دشمنِ اسلام قوتوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور خلافت کی ڈگمگاتی کشتی کو ساحلِ مراد تک سلامتی کے ساتھ پہنچانے کی اہلیت اگر کسی میں بدرجۂ اتم تھی تو وہ حضرت معاویہؓ کی ذات میں تھی۔ (ص ۱۴ طبع دوم و ص ۱۸ طبع سوم)

اور روافض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرات خلفاءِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں اس درجہ فروتر نہ تھے جتنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی حضرت سعد اور حضرت سعید رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں تھے یہی وجہ ہے کہ حضرات اہلِ سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو خلیفہ راشد مانتے ہیں مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ راشد نہیں کہتے۔ مؤلف نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جس حقیقت کا انکشاف کیا ہے اگر وہ صحیح ہوتی تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ان کو اپنا جانشین بناتے ورنہ کم از کم عشرہ مبشرہ میں سے جن چھ حضرات کی مجلس شوریٰ انھوں نے اپنی وفات پر انتخابِ خلافت کے لئے بنائی تھی اس میں ان کو بھی نامزد کرتے اور اگر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے کسی وجہ سے ان کو نظر انداز کر دیا تھا تو اربابِ شوریٰ ضرور ان کا خیال کرتے۔

مثالب حسین (رضی اللہ عنہ)

غیر معقول حب جاہ کے کارن، عہد شکنی اور بغاوت کا قصور وار ولی اللہ کے روپ میں

[۱۵] ثابت ہے کہ حضرت حسین نے بھی امیر المومنین معاویہؓ کی زندگی میں امیر یزیدؒ کی ولیعہدی کی بیعت کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آزاد اور بے لاگ مورخین[۱۶] نے حضرت حسینؓ کے اقدام خروج کے سلسلہ میں اسی بات کو بیان کیا ہے۔ مشہور مورخ دوزی کا ایک فقرہ اس بارے میں قابلِ لحاظ ہے وہ لکھتا ہے :-

"اخلاف (یعنی آنے والی نسلوں) کا عموماً یہ شعار[۱۷] رہا ہے کہ وہ ناکام مدعیوں کی ناکامی پر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات انصاف، قومی امن اور ایسی خانہ جنگی کے ہولناک خطروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ایسے ناروک دی گئی ہو، یہی کیفیت اخلاف کی (حضرت) حسینؓ کے متعلق ہے جو ان کو ایک ظالمانہ جرم کا کشتہ خیال کرتے ہیں۔ ایرانی شدید تعصب نے اس تصویر میں خدوخال بھرے اور (حضرت) حسینؓ کو بجائے ایک معمولی قسمت آزما کے جو ایک انوکھی لغزش و خطائے ذہنی اور قریب قریب غیر معقول حب جاہ کے کارن ہلاکت کی جانب تیز گامی سے رواں دواں ہوں، ولی اللہ[۱۸] کے روپ میں پیش کیا ہے، ان کے ہم عصروں میں اکثر و بیشتر انھیں ایک دوسری نظر سے دیکھتے تھے ۔ وہ انھیں عہد شکنی اور بغاوت کا قصور وار خیال کرتے تھے اس لئے کہ انھوں نے (حضرت) معاویہؓ کی زندگی میں یزیدؒ کی ولیعہدی کی بیعت کی تھی اور اپنے حق یا دعوے کو ثابت نہ کر سکے تھے۔" (ص ۴۷)

---

[۱۵] اس کے ثبوت میں مؤلف نے تاریخ اسلام کے پورے سرمایہ میں سے خود یزید کے ایک شعر کو پیش کیا ہے اور پھر اس کا غلط ترجمہ کر کے اس سے استدلال کیا ہے حالانکہ اس شعر کو مؤلف کے اس دعوی سے دور کا بھی تعلق نہیں جس کی تفصیل پنے مقام پر آئے گی۔ [۱۶] جن میں ایک شخص بھی شرف اسلام سے مشرف نہیں۔ [۱۷] یہ یورپ کا شعار رہا ہو تو رہا ہو سلمانوں کے متعلق ایسا گمان کرنا صحیح نہیں، تاریخِ اسلام میں ایک نظیر بھی اس سلسلہ میں نہیں پیش کی جا سکتی کہ سلمانوں نے محض جذبات کی بنا پر کسی ناکام مدعی کی حمایت کی ہو وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مدعی حق کا داعی تھا باطل کا حامی، ان کی نفرت و محبت کا معیار محض شرعی ہے نہ کہ جذباتی۔ [۱۸] یہ ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا وقف عباسی کے آزاد اور بے لاگ محققین کے نزدیک۔

(تاریخ مسلمانانِ اسپین مولفہ رینہارٹ دوزی مترجمہ فرانسس گریفن اسٹوکس مطبوعہ لنڈن ۱۹۱۳ء)

(خلافت معاویہ ویزید ص ۷۶ طبع دوم و ص ۹۴ و ۹۵ طبع سوم)

حب جاہ، شیخی اور بے وجہ کی خوش اعتقادی

"اپنی دانست میں حضرت حسینؓ خلافت کا اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتے تھے اور اپنا "حق" لینا اپنے اوپر واجب کر چکے تھے۔ مسلم کے واقعہ سے آپ نے یہ صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس حالت میں کوفہ جانا مفید مطلب نہ ہوگا مگر آپ کے ساتھی کوفیوں نے جب آپ کو پھر ترغیب دی اور یقین دلایا کہ آپ کی شخصیت مسلم کی طرح نہیں ہے آپ کی صورت دیکھتے ہی لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑیں گے حصولِ مقصد کے جذبے نے حزم واحتیاط پر غلبہ پالیا اور جس طرح اپنے ہمدردوں اور عزیزوں کے عاقبت اندیشانہ مشوروں کو نظر انداز کر دیا تھا اور کوفیوں کے مواعید پر بھروسہ کر کے مکہ سے روانہ ہو گئے تھے وہی خوش اعتقادی اب بھی آگے بڑھنے کی محرک ہوئی۔ آزاد مورخ دوزی نے لکھا ہے کہ ان کوفیوں کے خطوط ومراسلات کے مندرجہ مواعید پر انھیں ایسا اعتماد تھا کہ لوگوں کے سامنے فخریہ پیش کرتے تھے۔ مورخ دوزی کا یہ فقرہ یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا :-

"مدت کے ضرورت سے زیادہ سریع الاعتقاد اور بھولے گورنر کی نگرانی سے بچ کر حسینؓ بمعیت عبداللہ (ابن الزبیرؓ) مکہ کی مقدس سرزمین پر پناہ گزین ہوئے تھے اہالیانِ کوفہ کے خطوط ومراسلات جب ان کو موصول ہو گئے تو ان کو اس سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ ان خطوط میں التجا کی گئی تھی کہ وہ آن کر ان کی قیادت کریں۔ کوفیوں کی ان تحریرات میں یہ عہد کیا گیا تھا کہ ہم آپ کو خلیفہ تسلیم کر لیں گے اور پوری آبادی کو آپ کی خلافت قبول کرنے پر راضی کر لیں گے۔ کوفہ سے قاصد پر قاصد بڑی سرعت سے آتے رہے آخری قاصد جو بڑی طویل درخواست لایا تھا اس کے ساتھ کوئی ڈیڑھ سو صفحات کی فہرست لوگوں کے دستخطوں کی منسلک تھی۔ حسینؓ کے دوراندیش دوستوں نے لاکھ منت سماجت کی کہ ایسی خطرناک مہم کے اندر با عاقبت اندیشانہ اپنے کو جوکھم میں نہ ڈالیں اور ان لوگوں کے مواعید اور مصنوعی جوش وولولہ پر اعتماد نہ کریں جنھوں نے ان کے والد سے دغا کی تھی اور ان کو دھوکہ دیا تھا مگر حسینؓ نے حب جاہ کی مہلک ترغیبات پر کان دھرنے کو ترجیح دی اور ان لاتعداد خطوط (دعوت ناموں)

کی فخر یہ طور سے نمائش کرتے رہے جو ان کو موصول ہوئے تھے اور جن کی تعداد جیسا کہ شیخی سے کہتے تھے ایک اونٹ کے بوجھ کے مساوی تھی۔ قضا کے سامنے بالآخر انھوں نے سر جھکا دیا اور کوفہ روانہ ہوگئے . . . .

. . . . (قتل مسلم کے) مصیبت خیز واقعات کی خبر حسین . . . . . . کو اس وقت ملیں جب کوفہ سے کچھ زیادہ دور نہ تھے اور ان کے ساتھ مشکل سے سو نفوس تھے جن میں زیادہ تر ان کے اہلِ خاندان[1] تھے بایں ہمہ انھوں نے سفر جاری رکھا اسی خوش اعتقادی کی سحر آفریں کشش نے جو دعویداروں پر اثر انداز ہوا کرتی ہے۔ ان کا ساتھ نہ چھوڑا، ان کو یقین تھا کہ جیسے ہی شہر کوفہ کے پھاٹک پر جا موجود ہوں گے اہالیانِ شہران کے مقاصد کی خاطر ہتیار سنبھال لیں گے۔ (ص ۴۶ تاریخ مسلمانانِ اسپین مولفہ رینہارٹ دوزی مترجمہ فرانسس گریفن مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء)

(خلافت معاویہ و یزید ص ۱۶۹ و ۱۷۰ طبع دوم و ص ۱۹۳ تا ۱۹۵ طبع سوم)

ناعاقبت اندیشانہ مہم اور پھر اس پر عمر بن سعد ابن زیاد اور یزید کو قاتل سمجھنا

"ولندیزی محقق دے خوئے نے اپنے محققانہ مقالہ میں حادثۂ کربلا کے متعلق ایک موقع پر لکھا ہے کہ:۔

"کسی دوسرے انجام اور نتیجہ کی توقع اس ناعاقبت اندیشانہ مہم کے سلسلہ میں نہیں کی جا سکتی تھی مگر پیغمبر (صاحب) کے نواسہ، علی (رض) کے فرزند اور ان کے لئے اہلِ خاندان (کے مقتول ہو جانے) کا تعلق اور شمول چونکہ اس حادثہ میں تھا اس لئے حسین کے دلی حامیوں نے جو اپنی درخواستوں (دعوت ناموں) کی بنا پر اس حادثہ فاجعہ کا اصلی اور حقیقی سبب ہوئے تھے (انھوں نے بعد میں) اس کو ایک المیہ بنا لیا اور روایات نے تدریجاً ایک افسانہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ عمر بن سعد (رض) اور اس کے فوجی افسروں کو، عبید اللہ (بن زیاد) کو حتیٰ کہ یزید (رح) کو بھی قاتل سمجھا جانے لگا۔ (ص ۲۹ ج ۱، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا گیارہواں ایڈیشن) (خلافت معاویہ و یزید ص ۱۹۸ و ۱۹۹ طبع دوم و ص ۲۴۳ و ۲۴۴ طبع سوم)

---

[1] اس تصریح کے باوجود مؤلف یہ بھی فرماتے جاتے ہیں:۔ "ساٹھ کوفی توسعیت میں چلنے کے انتظار میں ٹھیرے رہے جو بعد میں ان کے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوئے" (ص ۱۱۵ طبع دوم و ص ۱۳۶ طبع سوم)
اگر یہ ساٹھ کوفیوں والی بات صحیح ہے تو حسینی قافلہ میں جو مشکل سے سو نفوس پر مشتمل تھا زیادہ تر تعداد اُن کوفیوں کی ہوئی نہ کہ ان کے اہلِ خاندان کی۔

"ولندیزی محقق دے خوئے نے صحیح کہا ہے کہ جب اس حادثہ کے بیانات نے افسانہ کی سی نوعیت اختیار کرلی ابن سعدؓ کو بھی قاتل کہا جانے لگا" ؎۱

(خلافت معاویہ ویزید ص ۲۱۳ طبع دوم وص ۲۶۱ طبع سوم)

"بقول محقق دے خوئے حادثہ کربلا نے رفتہ رفتہ اور تدریجاً افسانہ کی شکل اختیار کرلی وضعی روایتوں اور مسلسل پروپگنڈے، مثالب کی لغو حکایتوں، مناقب کی جھوٹی حدیثوں سے واقعات تاریخ مسخ صورت میں پیش کئے گئے حقیقت تعصبات کے پردوں میں روپوش ہوگئی اور ایسی فضا پیدا کردی گئی کہ سب و شتم کے سوائے کسی کو کچھ یاد نہیں رہا اور اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ ؎

انھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا — کہ ابن معاویہ بے لوث وفاسق اور ستمگر تھا

(خلافت معاویہ ویزید ص ۳۶۴ و ۳۶۵ طبع دوم وص ۵۰۸ طبع سوم)

حادثہ کربلا کی اصل حقیقت بے لاگ تحقیق کے مطابق

ارشاد ہوتا ہے :-

"انتہائی ناعاقبت اندیشی سے فوجی دستہ کے سپاہیوں پر جو ہتھیار رکھوانے کی غرض سے گھیرا ڈالے ہوئے تھے اچانک قاتلانہ حملہ کردیا گیا ؎۲۔ آزاد اور بے لاگ محققین و مستشرقین نے بے لاگ تحقیق سے اسی بات کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کے فوجیوں پر اس طرح اچانک حملے سے یہ حادثۂ محزون پیش آگیا۔ انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام کے مقالہ نویسوں نے کہا ہے کہ :-

---

؎۱ مؤلف کو دے خوئے کی تحقیق مبارک، لیکن مسلمانوں کے لئے امام بخاری کا یہ بیان کافی ہے کہ

حدثنا موسی ثنا سلیمان بن مسلم ابوالمعلی العجلی قال سمعت أبی ان الحسین لما نزل کربلاء فاول من طعن فی سرادقہ عمر بن سعد، فرأیت عمر بن سعد و ابنیہ قد ضربت اعناقہم وعلقوا علی الخشب ثم الھبت فیھم النار۔ (تاریخ صغیر)	ہم سے موسیٰ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہمیں سلیمان بن مسلم ابوالمعلی عجلی نے بتایا کہ میں نے اپنے والد سے سنا فرماتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا میں فروکش تھے تو سب سے پہلے جس شخص نے ان کے سراپردہ میں نیزہ مارا وہ عمر بن سعد تھا، پھر میں نے (یہ منظر بھی) دیکھا کہ عمر بن سعد اور اس کے دونوں بیٹوں کی گردنیں ماری گئیں اور انھیں شہتیر پر لٹکا کر نذر آتش کردیا گیا۔

؎۲ یہ ایسی غلط بیانی ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔

•گورنر (کوفہ) عبیداللہ بن زیاد کو یزید نے حکم دیا تھا کہ (حسینی قافلہ) کے ہتھیار لینے کی تدابیر کرے اور (صوبہ) عراق میں ان کے داخل ہونے اور جھگڑا و انتشار پھیلانے سے باز رکھے۔ کوفہ کے شیعان علی میں سے کوئی مرد کو کھڑا نہ ہوا حسین اور ان کے مٹھی بھر متبعین نے اپنے سے بدرجہا طاقتور فوجی دستہ پر جو ان سے ہتھیار رکھوا لینے کو بھیجا گیا تھا غیر آل اندیشانہ طور سے حملہ کر دیا۔[1] (ص ۱۱۹۲)

(خلافت معاویہ و یزید ص ۲۱۱ و ۲۱۲ طبع دوم و ص ۲۵۹ طبع سوم)

ملاحظہ فرمایا آپ نے

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

مناقب یزید

پہلے یہ پڑھ لیجئے:۔

"اغانی کے غالی مؤلف نے امیر یزیدؒ کی اس غیرت و حمیت ملیہ اور حرارت دینیہ کے متعلق کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان اور محترم صحابی کی نعش کی بے حرمتی کا خیال بھی برداشت نہ کر سکے، بے خوف خطر رومیوں کے ہجوم پر حملہ آور ہوئے یہ لغو توجیہ کی ہے کہ رومی کیمپ میں چونکہ قیصر روم اور جبلہ بن ایہم کی خوبصورت بیٹیاں موجود تھیں ان پر ہاتھ ڈالنے اور قبضہ کرنے کا جذبہ اس بے باکانہ حملہ کا محرک

---

[1] اسی کے ساتھ مؤلف کا یہ بیان بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔
"بہرحال حضرت حسین رضہ کی طہارت طینت کی برکت تھی کہ آپ نے بالآخر اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔۔۔
۔۔۔ حضرت حسینؓ کی یہ سعادت کبری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خروج عن الجماعت کی شر سے محفوظ رکھا اور بالآخر اس کی توفیق ارزانی فرمائی کہ جماعت کے فیصلے کی حرمت برقرار رکھنے کا اعلان کر دیں اقدام خروج میں آپ نے غلطی کی تھی مگر آخر میں جب خروج پر ابھارنے والوں کی غداری عیاں ہو گئی تو آپ نے وہی کیا جو آپ کے برادر بزرگوار (حضرت حسنؓ) کے منشا کے مطابق، خیر خواہوں اور ہمدردوں کی رائے کے موافق اور کتاب و سنت کی روشنی میں واجب تھا۔" (ص ۱۷۸ و ۱۷۹ طبع دوم و ص ۲۰۵ طبع سوم)
جائے غور ہے دم آخرین حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طہارت طینت اور ان کی سعادت کبریٰ کا اعتراف کرتے ہوئے کس سادگی کے ساتھ مولف نے ان پر قاتلانہ حملہ کا الزام عائد کیا گیا ہے۔

اصلی تھا۔ اس قول کی رکاکت خود ہی عیاں ہے، بعض مستشرقین نے جنھیں خلفائے اسلام کی تنقیص کی حکایتیں بیان کرنے میں خاص لطف آتا ہے[۱] اغانی کے حوالہ سے یہ حکایتیں نقل کی ہیں، پروفیسر حتی نے بھی امیر یزیدؒ کے بارے میں اس حکایت کو بیان کیا ہے لیکن دوسری جگہ حاشیہ پر یہ بھی فرما دیا ہے کہ اغانی وغیرہ کی ان روایات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے جو خلفاء کی رنگین زندگی سے متعلق ہوں"[۲]

(ص ۲۱۳ و ۲۱۴ طبع دوم و ص ۲۲۹ طبع سوم)

عرب کا سورما "جہادِ قسطنطنیہ میں سپہ سالار لشکر[۳] امیر یزیدؒ نے حسنِ انتظام اور ذاتی شجاعت و شہامت کا ثبوت دیا اور امتیازی درجہ حاصل کیا جس کی بنا پر ملت کی طرف سے "فتی العرب" (عرب کا سورما) کا خطاب پایا۔ امیر یزیدؒ ہی عرب کے پہلے شخص ہیں جنھیں یہ خطاب دیا گیا۔[۴] امیر یزیدؒ کے اس خطاب "فتی العرب" کو تو پروفیسر حتی نے بھی تسلیم کیا ہے" (ص ۲۰۱ ہسٹری آف دی عربس)

(خلافت معاویہ و یزید ص ۲۹ طبع دوم و ص ۳۶ طبع سوم)

یزید کی شجاعت و بسالت "مشہور یورپین مورخ ایڈورڈ گبن نے اپنی تالیف "تاریخ عروج و زوالِ روما الکبری

---

[۱] یہ بھی مؤلف کی بے لاگ ریسرچ کا ایک نمونہ ہے کہ مستشرقین کی اس حرکت ناشائستہ کو تسلیم کر لینے کے باوجود جب بھی اپنی کتاب میں ان سے کچھ نقل کرتے ہیں پہلے ان کو "آزاد اور بے لاگ محقق" کہہ کر ان کی جناب میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں جب یہ مستشرقین کچھ بکواس کریں تو مؤلف ان کی بات کو سر آنکھوں پر رکھیں اور اسے حرفِ آخر سمجھیں اور انھیں آزاد اور بے لاگ محقق بتائیں لیکن یہی لوگ جب مؤلف کے ممدوح امیر یزید کے متعلق زبان چلانے لگیں تو ان کی شہادت ناقابلِ اعتبار ٹھہرے کیونکہ "ان کو خلفاء اسلام کی تنقیص کی حکایتیں بیان کرنے میں مزہ آتا ہے"۔

[۲] یہ واضح رہے کہ یہ "رنگین زندگی کے واقعات" مؤلف کے ممدوح یزید جیسے لوگوں ہی کے متعلق ہو سکتے ہیں اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بابت تو اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

[۳] لیکن سنن ابی داؤد کتاب الجہاد میں جو روایت مذکور ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت خالد ابن الولید رضی اللہ عنہ کے فرزند نامدار عبدالرحمٰن بن خالد تھے۔

[۴] واقعی بجا ہے یزید سے پہلے عرب میں کوئی سورما ہوا کب ؟ یہ ہوا شیعوں کے اس نعرہ کا اصل جواب کہ "لا فتی الا علی لا سیف الا ذو الفقار"۔

میں امیر یزیدؒ کے جہادِ قسطنطنیہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضؓ کی شرکت اور وفات پانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس معرکۂ جہاد میں (امیرالمؤمنین) معاویہؓ کے فرزند یزیدؒ کی موجودگی اور ان کی شجاعت و بسالت کی مثال اس وقت اسلامی فوج کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کا موجب اور سبب بن گئی تھی، اس مورخ نے یہ بھی بالصراحت بیان کیا ہے کہ (حضرت) حسینؓ بھی قسطنطنیہ کے اس اولین جہاد میں موجود تھے۔ گبن کے الفاظ یہ ہیں:۔

"حسن[1] کے چھوٹے بھائی حسین نے اپنے والد سے جرأت و دلیری کا کچھ نہ کچھ[2] حصہ ورثہ میں پایا تھا۔ اور عیسائیوں کے خلاف قسطنطنیہ کے جہاد میں امتیازی خدمت انجام دی تھی۔" (ص ۲۸۶ تاریخ عروج و زوال روما الکبریٰ، گبن۔)

(خلافتِ معاویہ و یزید، ص ۳۱۵ طبع دوم و ص ۴۳۲ طبع سوم)

یزید کے اوصافِ حمیدہ "علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری، پابندیٔ صوم و صلوٰۃ کے ساتھ امیر یزیدؒ حد درجہ کریم النفس، حلیم الطبع، سنجیدہ و متین تھے۔ ایک عیسائی رومی مورخ نے ان کی سیرت کے بارے میں ان کے ہم عصر کا بیان ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

"وہ (یعنی امیر یزید) حد درجہ حلیم و کریم، سنجیدہ و متین، غرور و خودبینی سے مبرا، اپنی زبردست رعایا کے محبوب، تزک و احتشامِ شاہی سے متنفر تھے۔ عام شہریوں کی طرح سادہ معاشرت سے زندگی بسر کرنے والے اور مہذب تھے۔" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۱۱۶۳)

(خلافتِ معاویہ و یزید، ص ۴۹ طبع دوم و ص ۶۲ طبع سوم)

یزید کی محبوبیت "الغرض والدِ محترم کی تربیت نے اس ذہین فرزند کی فطری صلاحیتوں کے سنوارنے اور خیر القرون کے بقیہ صحابہ و تابعین کی مجلسوں اور صحبتوں کے ماحول کے اثرات نے امیر یزید کی سیرت میں وہ پاکیزگی پیدا کی کہ غیر مسلم ہم عصر مورخ بھی ان کے حلم و کرم رحمدلی اور دیگر صفات حسنہ کے معترف ہیں جیسا کہ ایک رومی مورخ نے بتایا ہے کہ امیر یزیدؒ پبلک اور عوام کے کس درجہ محبوب تھے۔" (ص ۳۰۸ طبع دوم و ص ۴۲۲ و ۴۲۳ طبع سوم)

[1] یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر تعریض تو نہیں ہے؟ [2] یہ "کچھ نہ کچھ" کی بھی ایک ہی رہی۔

سیرت یزید پر آزاد اور بے لاگ رائیں | "سیرت یزیدؒ کے بارے میں غیر مسلم مورخین و محققین کی رائیں ہی یقیناً آزاد اور بے لاگ رائیں ہو سکتی ہیں[1]۔ ان غیر مسلم مورخین کے بعض اقوال یہاں نقل کرنے بیجا نہ ہوں گے ـــ

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لائق مقالہ نگار قمطراز ہیں:۔

"یزید نہ تو غیر سنجیدہ اور بیہودہ شہزادہ تھا اور نہ ایسا لاابالی اور بے پرواہ حکمران جیسا ان مورخین نے بیان کیا ہے جو یا تو شیعوں کے بغض و عناد سے تاثر پذیر ہیں یا عراق و حجاز و شام کے سیاسی جھگڑوں کے حالات سے یا پھر اس کی بہت ہی مختصر سی مدت حکمرانی کے حادثہ کا اثر لئے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت ہے کہ یزید نے (اپنے والد) معاویہ کی پالیسی و طریقہ کار کے بدستور جاری رکھنے کی کوشش کی اور ان کے[2] باقی ماندہ رفقاء کار کو قائم و برقرار رکھا۔ وہ خود شاعر تھا۔ موسیقی کا ذوق رکھتا تھا۔ اہلِ ہنر اور شعراء کا قدردان اور ادب و آرٹ کا مربی اور سرپرست تھا"۔

مملکت کے شمالی حصے میں اس نے نئی فوجی چھاؤنی "جند قنسرین" قائم کر کے ملک شام کے دفاع اور عسکری قلعہ بندی کی تکمیل کی اور انتظامی نظام کو مکمل کر دیا۔ مالیات کی از سرِ نو تنظیم کی، نجرانی عیسائیوں کے جزیہ کی شرح کو جو خلیفہ عمرؓ کے عہد میں ملک عرب سے تحکمانہ طور سے خارج البلد کئے گئے ہلکا کر دیا۔ برخلاف اس کے سامری یہودیوں پر جن کو ابتدائی فتوحات اسلامی کے زمانہ میں بصلۂ خدمات جزیہ سے مستثنیٰ کیا گیا تھا جزیہ عائد کر دیا۔

یزید کو زراعت کی ترقی سے دلچسپی تھی، دمشق کے نخلستانی علاقہ غوطہ میں آبپاشی کے سسٹم کو مکمل کرنے کی غرض سے بالائی علاقہ میں ایک نہر کھدوائی جو اس کے نام سے نہر یزید کہلاتی ہے۔ اور مضافات سلیحیہ کی اس سے آبپاشی ہوتی ہے خلفائے اسلام میں تنہا یزید ہی ایسا خلیفہ ہے جس کو "مہندس" (نہر و کاریز کا ماہر و انجینیر) کا لقب دیا گیا تھا"۔

---

[1] بے شک بے شک بھلا مسلمان اس ذات ستودہ صفات کی قدر و منزلت کیا جانیں کہ مثل مشہور ہے ولی را ولی می شناسد
[2] اگر کوئی مسلمان یزید کے بارے میں یہ لکھ دیتا تو مؤلف بگڑ جاتے مگر چونکہ یہ آزاد اور بے لاگ محققین کی تصریح ہے اس لئے مؤلف اس کو بسر و چشم ماننے کے لئے تیار ہیں۔

سیرت یزید کے پیش پا افتادہ تصویر کشی کے قطعاً خلاف مؤلف Continutica by Zantino Arabica اپنی تالیف میں یہ تصویر پیش کرتا ہے۔

"یزید صدر درجہ متواضع و حلیم سنجیدہ و متین، خود بینی و تکبر سے مبرا، اپنی زیردست رعایا کا محبوب، تزک و احتشام شاہی سے متنفر، معمولی شہریوں کی طرح سادہ زندگی بسر کرنے والا اور مہذب تھا۔[۱]

ولہاؤزن مورخ کا قول ہے کہ "کسی بھی خلیفہ کی[۲] مدح و ثنا اس طور سے نہیں ہوئی یہ الفاظ تو دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔[۳]" (ص ۱۱۶۳ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

ایک اور بلند پایہ محقق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار روئے خوئے امیر یزیدؒ کی سیرت کے بارے میں رومی مورخ کے مندرجہ بالا الفاظ نقل کرنے کے بعد جن میں امیر موصوف کو طبعاً سنجیدہ و نرم خو و مہذب بتایا گیا ہے[۴] لکھتے ہیں:۔

اس قول کی تصدیق اس امر واقعہ سے ہوتی ہے کہ معاویہ ثانی (فرزند یزیدؒ) کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اپنے والد کی طرح نرم خو حکمراں تھا۔ یزیدؒ کے مخالفین نے بغض و تعصب سے ان کے بارے میں جو بیان کیا ہے پھر روایتوں سے اور بھی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں اس کی بہت کچھ تردید (رومی مورخ کے) اس بیان سے ہو جاتی ہے۔ شراب نوش ہونے کے اتہام کے خلاف تو خود یزید نے اس وقت جب ابن زبیر کے مقابلے میں فوجی دستہ بھیج رہا تھا اپنے اشعار میں احتجاج کیا تھا۔ اس بارے میں فیصلہ کن شہادت تو ابن الحنفیہؒ (برادر حسینؓ) کی ہے جنہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اہلِ مدینہ نے جو الزامات (یزیدؒ کی شراب نوشی وغیرہ کے) لگائے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ یزیدؒ شکار کے شوقین تھے مگر وہ امن پسند و صلح جو اور فیاض و فراخ دل شہزادہ تھا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، گیارہواں ایڈیشن[۵])۔ (خلافت معاویہ و یزید ص ۲۲۳ تا ۲۲۷ طبع دوم و ص ۲۲۳ تا ۲۲۸ طبع سوم)۔

[۱] یہاں طبع سوم میں حاشیہ پر مؤلف نے لکھا ہے کہ "علامہ ابن کثیر نے بھی تقریباً یہی الفاظ لکھے ہیں" جو محض غلط ہے۔
[۲] خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا تو خیر سے ذکر ہی کیا، کیا خود یزید کے والد ماجد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور مروان کی بھی نہیں؟
[۳] ایک غیر مسلم مستشرق کے دل کی گہرائی سے تو ایسی ہی بات نکلے گی۔ [۴] یہ بتلانے والا بھی غیر مسلم ہی ہے۔
[۵] سیرت یزید پر ان غیر مسلم مورخین و محققین کی یہ آزاد اور بے لاگ رائیں قلمبند کرنے کے بعد (باقی بر صفحہ آئندہ)

دیکھا آپ نے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی — میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

مستشرقین کی یہی لغویات ہیں جو اس کتاب کی جان ہیں اور جن کو مؤلف خیر سے بے لاگ تحقیقات

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) آخر مؤلف کو خیال آ ہی گیا کہ کسی ایسے شخص کی رائے بھی اگر ان محققین کی تائید میں پیش کردی جائے جو گو آزاد اور بے لاگ محقق نہ سہی تاہم مسلمان تو ہو چنانچہ بعد از تلاش بسیار ایک ہمنوا اس سلسلہ میں ان کو فراہم ہوگیا، فرماتے ہیں:۔

"ان غیر مسلم محققین کے علاوہ علامہ ابن کثیرؒ نے سیرتِ یزیدؒ کے بارے میں جو فقرات لکھے ہیں وہ آپ ابتدائی اوراق میں پڑھ چکے ان سے ان بیانات کی پوری تائید ہوتی ہے کہ یزیدؒ کی ذات میں حلم وکرم فصاحت وشجاعت کی عمدہ صفات تھیں اور ملک داری کے بارے میں عمدہ رائے رکھتے تھے۔"

(خلافتِ معاویہ ویزید، ص ۳۲۷ طبع دوم وص ۴۴۸ طبع سوم)

علامہ ابن کثیرؒ کی جو وقعت مؤلف کی نظر میں ہے پہلے اس کو ملاحظہ کر لیجئے، ارشاد ہے۔

"اب ایک اور علامۂ وقت مورخ ومحدث (ابن کثیرؒ) کا ارشاد بھی ملاحظہ ہو جنھوں نے ایک موقع پہ یہ بھی فرمایا ہے کہ ابو مخنف کی روایتیں قابلِ اعتبار نہیں لیکن ابن جریر طبری جیسے ائمہ نے چونکہ ان کو درج کردیا ہے اس لئے ہم بھی نقل کئے دیتے ہیں۔" (ص ۱۲۲ طبع دوم وص ۱۴۴ طبع سوم)

معلوم ہوا ابن کثیرؒ مؤلف کی نظر میں آزاد و بے لاگ محقق نہیں ہیں۔ اب ابن کثیر کے فقرات ملاحظہ ہوں مؤلف ناقل ہیں:۔

وقد كان يزيد فيه خصال محمودة من	اور یزید کی ذات میں قابل ستائش صفات حلم وکرم
الكرم والحلم والفصاحة والشعر والشجاعة	فصاحت وشعر گوئی اور شجاعت وبہادری کی تھیں نیز
وحسن الرأى فى الملك وكان ذا	معاملاتِ حکومت میں عمدہ رائے رکھتے تھے اور وہ
جمال حسن المعاشرة (البدايه والنهايه	خوبصورت اور خوش سیرت تھے۔
ج ۸ ص ۲۳۰ وتاريخ الاسلام ذهبى ج ۳ ص ۹۳)	(ص ۴۹ طبع دوم وص ۹۳ طبع سوم)

مؤلف فقرات تو ابن کثیرؒ کے لکھنے بیٹھے تھے اس لئے قاعدہ سے یہاں حوالہ صرف ان کی تصنیف البدایہ والنہایہ کا ہی ہونا چاہیئے تھا مگر قلم نے جولانی دکھلائی تو حافظ ذہبی کی تاریخ الاسلام کا بھی حوالہ آگیا۔ لیجئے "یک نہ شد دو شد" اور کہا چاہیئے اب تو دو شاہد عادل مل گئے۔ مگر یاد رہے اس دوسرے حوالہ کا وجود صرف مؤلف کے ذہن رسا میں ہے واقع میں اس کا وجود نہیں ہے، کیونکہ حافظ ذہبی کی جو کتاب تاریخ الاسلام کے نام سے حال میں مصر سے طبع ہو کر شائع ہوئی ہے اس میں اس عبارت کا سرے سے پتہ ہی نہیں، البتہ البدایہ والنہایہ میں ان فقروں کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے ا۔

وكان فيه ايضا اقبال على الشهوات وترك — اور اس میں نفسانی خواہشوں پر ڈھلنا اور بعض وقت

(باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

سمجھ بیٹھے ہیں، ساری کتاب ان ہی لغویات کی شرح ہے اور یہ ہفوات و خرافات اس کا متن ہیں۔
ان بے لاگ تحقیقات یا مفتریاتِ واہیہ پر ایک بار پھر نظر ڈالئے اور غور فرمائیے کہ ان میں صداقت کا کہیں نام و نشان بھی ہے۔ عباراتِ مذکورہ صرف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مطاعن سے پُر نہیں بلکہ ان میں خلفاء ثلاثہ حضرات عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم پر بھی نازیبا اعتراضات ہیں۔ بس تعریف کے پُل باندھے گئے ہیں تو مؤلف کے ممدوح امیر یزید کے۔ اس "بے لاگ تحقیقات" کے متعلق سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے جو مؤلف نے ابو مخنف وغیرہ کے بیانات کے بارے میں کہا ہے کہ

"یہ بیانات ناقابلِ اعتبار، حقیقت سے بعید، بلکہ طبع زاد ہیں۔ کچھ کذب و افتراء ہے، کچھ کذب حق نما ہے۔"

(خلافت معاویہ و یزید ص ۱۹۸ طبع دوم و ص ۲۲۲ طبع سوم)

واقعہ یہ ہے کہ مؤلف کے یہ الفاظ ابو مخنف سے زیادہ ان مستشرقین کے بیانات پر چسپاں ہیں چنانچہ حسب ذیل امور

۱۔ نجرانی عیسائیوں کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تحکمانہ طور پر خارج البلد کیا جانا۔
۲۔ معاملہ فہم لوگوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرنا۔
۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ شہید کی جانشینی کا استحقاق فی الواقع حاصل نہ ہونا۔
۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طلب خلافت میں تقدس و پارسائی کے جذبہ کا کارفرما نہ ہونا۔ بلکہ حصولِ اقتدار و حب جاہ کی ترغیب کا پایا جانا۔
۵۔ معاملہ فہم لوگوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرنے کے باوجود حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

بعض الصلوات فی بعض الاوقات و اماتتھا فی غالب الاوقات۔	کسی نماز کا سرے سے چھوڑ دینا اور اکثر اوقات نمازوں کا بے وقت پڑھنا بھی تھا۔

لیکن حافظ ابن کثیرؒ کے یہ فقرات چونکہ مؤلف کے ممدوح امیر یزید کی شخصیت کو مجروح کرتے تھے اس لئے ان کو قصداً نظر انداز کر دیا۔ یہ ہے مؤلف کی بے لاگ ریسرچ کا ادنیٰ نمونہ کہ صرف تعریف کو لے لیا اور تنقید کو چھوڑ دیا۔

علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دینا۔

۶۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید سے بیعت کرلینا۔

۷۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا (نعوذ باللہ) اخلاق رذیلہ حب جاہ، شیخی، فخر و نمائش وغیرہ میں مبتلا ہونا۔

۸۔ عمر بن سعد اس کے فوجی افسروں ابن زیاد اور یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمہ داری سے بالکل بری قرار دینا۔

۹۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے مٹھی بھر متبعین کا انتہائی ناعاقبت اندیشی سے فوجی دستہ کے سپاہیوں پر جو ہتھیار رکھوانے کی غرض سے گھیر ڈالے ہوئے تھے اچانک قاتلانہ حملہ کر دینا۔

یہ سب کذب و افترا کی بدترین مثالیں ہیں اور یزید کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کذب حق نما کا پُرفریب نمونہ ہے۔

یزید کے اوصاف حمیدہ کا جو نقشہ مستشرقین نے کھینچا ہے اگر وہ صحیح ہے (اور مؤلف کے نزدیک یقیناً صحیح ہے کہ غیر مسلم مورخین و محققین کی رائیں ہی یقیناً آزاد اور بے لاگ رائیں ہو سکتی ہیں) تو ہمیں مؤلف کی فہم عالی پر تعجب ہوتا ہے کہ ان بے لاگ محققین کے علی الرغم انھوں نے اس کتاب میں اپنے ممدوح کے متعلق بعض ایسے نازیبا واقعات درج کر دیئے ہیں جن سے ان کی تمام مذکورہ بالا تصریحات پر پانی پھر جاتا ہے۔

یزید کی تواضع و متانت کے دو اہم واقعے

مثلاً تواضع اور متانت و سنجیدگی کے سلسلہ میں ذیل کے یہ دو واقعے جن کو مؤلف نے بڑی اہمیت دے کر بیان کیا ہے اور جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مؤلف کے ممدوح کا اپنے استاد محترم مربی و اتالیق نیز اپنے عم بزرگوار کے ساتھ کیا طرز عمل تھا۔ پہلا واقعہ مؤلف نے "تعلیم و تربیت" کے زیر عنوان اپنے ممدوح کی ثنا و صفت کرتے ہوئے اس طرح سپرد قلم کیا ہے:۔

"خوش بیان، حاضر جواب تھے، بچپن کا واقعہ ہے ان کے اتالیق نے کسی خطا پر سرزنش کی تھی، استاد شاگرد میں یہ گفتگو ہوئی:

فقال له مؤدبه: أخطأت يا غلام	اتالیق نے کہا: اے لڑکے تو نے خطا کی۔
فقال يزيد: الجواد يعثر۔	یزید نے کہا: اصیل گھوڑا ہی ٹھوکر کھاتا ہے۔

فقال المؤدب إي والله يضرب فيستقيم — اتالیق نے کہا: ہاں واللہ کوڑا کھاتا ہے تو سیدھا ہو جاتا ہے۔

فقال يزيد: إي والله فيضرب أنف سائسه — یزید نے کہا: ہاں واللہ پھر تو اپنے سائیس کی ناک چھوڑ ڈالتا ہے۔

(ص ۳ ج ۴ قسم ثانی انساب الاشراف بلاذری مطبوعہ یروشلم)

(خلافت معاویہ و یزید ص ۲۸۶ و ۲۸۷ طبع دوم و ص ۳۹۹ طبع سوم)

ظاہر ہے کہ اس مؤدبانہ گفتگو پر اتالیق تو یزید کی تواضع اور سنجیدگی کا دل سے معترف ہو گیا ہو گا اور اس طرز عمل کے ہوتے ہوئے سعادتمند شاگرد نے استاد سے جو کسب فیض کیا ہو گا اس کا تو کہنا ہی کیا۔ دوسرا واقعہ مؤلف نے "خطابت" کے زیر عنوان اس طولانی تمہید کے ساتھ لکھا ہے:۔

"صحابہ کرام و علماء و صلحاء کی صحبتوں کے علاوہ جس کا مختصر ذکر ابتدائی اوراق میں ہو چکا ہے امیر یزید ریعان سن سے اپنے والد محترم کی مجالس میں بالالتزام حاضر رہتے جوان جیسے ذہین و فطین تاثر پذیر اور اخاذ طبیعت کے نوجوان کے لئے درس گاہ کی حیثیت رکھتیں۔ سالہا سال یہ سلسلہ جاری رہا ان ہی مجالس میں سے ایک مجلس کا یہ لطیفہ مورخین نے بیان کیا ہے کہ جب ایک مرتبہ امیر زیادؓ اپنے صوبہ (عراق) سے دمشق آئے اور زر کثیر نیز جواہر سے مملو ایک صندوقچہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ کو پیش کیا تو اس سے خوش ہوئے امیر زیادؓ نے کھڑے ہو کر تقریر کی جس میں اپنے زیر حکومت علاقہ میں نظم و ضبط قائم کرنے کے سلسلہ میں اپنے حسن کارگزاری کا موثر پیرایہ میں تذکرہ کیا۔ امیر موصوف اعلیٰ پایہ کے مدبر و منتظم ہونے کے علاوہ زبردست خطیب بھی تھے۔ امیر یزید بھی اس مجلس میں موجود تھے اس لن ترانی کو سن کر ان سے نہ رہا گیا امیر زیادؓ کی تقریر کے بعد کھڑے ہوئے اور نہایت جامع الفاظ میں صرف تین فقرے ایسے بلیغ کہے کہ زیاد ستپٹا کے رہ گئے۔

وہ فقرے سنانے سے پہلے ناظرین کو یاد دلاؤں کہ زیاد ابتداءً دفتری خدمات پر مامور ہوئے تھے ان کے مادری نسب کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں جن میں سے ایک یہ روایت بھی علامہ ابن قتیبہ نے کتاب المعارف (ص ۱۲۵)[1] میں بزمرۂ اولاد حضرت ابو سفیانؓ بعنوان "زیاد بن ابی سفیان"

---

[1] کتاب المعارف میں (ص ۱۲۵ پر) بزمرۂ "اولاد ابی سفیان" نہیں بلکہ حضرت ابوبکرہ ثقفی رضی اللہ عنہ کے تذکرہ کے ضمن میں جو کہ زیاد کے اخیافی (ماں شریکی) بھائی تھے۔

والی
رحمہ اللہ تعالیٰ" بیان کی ہے کہ زیاد کی ماں سمیہ نام ایک عجمی کنیز مقام زندرود (ایران) کی رہنے
دہاں کے شہنشاہ کسریٰ کی جواری میں سے تھی جسے شہنشاہ مذکور نے یمن کے ایک حکمران ابی الخیر بن عمرو
الکندی کو ہبہ کر دیا تھا۔ یمنی حکمران جب ایران سے یمن واپس جاتا ہوا طائف سے گذر رہا تھا اتفاقاً
بیمار پڑ گیا وہاں کے طبیب الحرث بن کلدۃ بن عمرو بن علاج ثقفی کے علاج معالجہ سے شفایاب ہوا۔
اس کامیاب علاج کے صلے میں اس نے اس کنیز کو بھی طبیب مذکور کو دیدیا۔ طبیب خود عقیم تھا۔ اس
کے غلام سے دو بیٹے ابوبکر نفیع اور نافع ہوئے۔ اول الذکر کو صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا۔
اپنے کو "مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہا کرتے تھے۔ ان کے باپ کے فوت ہو جانے پر ان کی ماں
سمیہ کا زمانۂ جاہلیت کے پانچ مروجہ نکاحوں میں سے ایک قسم کا نکاح ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ہوا جس سے
زیاد پیدا ہوئے[۲] جاہلیت کے مروجہ نکاحوں میں سے کسی نکاح سے جو بچہ پیدا ہوا اس کا نسب اسلامی

[۱] بے شک المعارف (ص ۱۵۱) میں زیاد کے لئے "رحمہ اللہ تعالیٰ" کے الفاظ ہیں جو اگر مؤلف کے قلم سے ہیں تو ان کی ناصبیت کی غمازی کرتے ہیں اور زیاد کے ساتھ ان کی عقیدت کے ترجمان ہیں۔ ابن قتیبہ کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں تصریح بھی کی ہے کہ

قان فی ابن قتیبۃ انحرافاً عن اھل البیت — ابن قتیبہ میں اہل بیت سے انحراف ہے۔

[۲] یہ بات کہ

"ان کے باپ کے فوت ہو جانے پر ان کی ماں سمیہ کا زمانۂ جاہلیت کے پانچ مروجہ نکاحوں میں سے
ایک قسم کا نکاح ابوسفیان سے ہوا جس سے زیاد پیدا ہوئے"

معارف ابن قتیبہ میں مذکور نہیں نہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں (ص ۱۲۵ پر) اس کا پتہ ہے اور نہ (ص ۱۵۱ پر) "زیاد بن ابی سفیان رحمہ اللہ تعالیٰ" کے زیر عنوان۔ جناب مؤلف نے اپنی طرف سے اس عبارت کو بڑھا کر خواہ مخواہ مزید کی تکذیب کی۔ مزید کا دعویٰ تو یہ ہے کہ

"ہم نے زیاد کو ثقیف کی ولاء سے قریش کی طرف اور زیاد بن عبید کے انتساب سے حرب بن امیہ کی طرف منتقل کر دیا۔"

"ولاء" نصرت کے اس تعلق کو کہتے ہیں جو غلام کے آزاد ہو جانے کے بعد اس کو اپنے مولیٰ و آقا سے باقی رہتا ہے اور جس کی بنا پر اگر اس آزاد کردہ شخص کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی میراث اس کے مولیٰ یعنی آزاد کرنے والے کو پہنچتی ہے۔ زیاد کی ماں سمیہ حارث بن کلدہ ثقفی کی کنیز تھی (الاستیعاب فی اسماء الاصحاب از حافظ ابن عبدالبر) اس کا باپ عبید قبیلہ ثقیف کا غلام تھا۔ زیاد کا ایک شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے باپ عبید کو ایک ہزار درہم میں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ (الاستیعاب) چونکہ یہ اپنے باپ عبید کے یہاں پیدا ہوا تھا اس لئے اس کو زیاد بن عبید کہا جاتا تھا (باقی بر صفحۂ آئندہ)

شریعت کے مطابق تسلیم کیا جائے گا۔ امیر المومنین حضرت معاویہؓ نے اسی اصول کے تحت امیر زیاد کا نسب بعد تحقیقات شرعی تسلیم کیا اور انھیں اپنے والد حضرت ابو سفیانؓ کا بیٹا اور اپنا بھائی سمجھا۔

ان توضیحی کلمات کے بعد اب وہ روایت علامہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں سنیئے فرماتے ہیں کہ امیر یزیدؒ نے امیر زیادؒ کو مخاطب کرکے کہا:۔

ان تفعل ذلك يا زياد فنحن	اے زیاد تم نے یہ سب کچھ کیا تو (تعلّی کیوں ہے) کیونکہ ہم
نقلناك من ولاء ثقيف الى قريش	ہی تو ہیں جنھوں نے تم کو (قبیلہ) ثقیف کی ولاء (تعلق
ومن القلم الى المنابر ومن زياد	علیفی ورشتہ)[۱] سے ہٹا کر قریش میں ملایا اور قلم (کی گھس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (الاصابہ فی تمیز الصحابہ از حافظ ابن حجر عسقلانی) اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یزید کا مطلب ان طعنوں سے کیا تھا اور وہ زیاد پر کیا چوٹ کر رہا تھا۔ بات واضح ہے وہ یہ کہہ رہا ہے کہ زیاد یہ محض ہماری بندہ پروری ہے کہ ہم نے تجھ کو ابو سفیان کی اولاد بنا کر حرب بن امیہ کی نسل میں شامل کر لیا اور ہماری اس کارروائی کی بناء پر تیرا شمار خاندانِ قریش میں ہونے لگا ورنہ تیری حقیقت کیا تھی تو قبیلہ ثقیف کے عبید نامی ایک غلام کا لڑکا تھا چنانچہ اسی قبیلہ سے تیری ولاء کا تعلق تھا۔ مؤلف یہاں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے نکاح کی داستان سُنانے بیٹھ گئے ظاہر ہے کہ اگر ان سے اس کی ماں کا نکاح ہوا ہوتا تو وہ اپنے لختِ جگر کو مرتے دم تک اس طرح ایک غلام کی فرزندی میں کس طرح دیکھ سکتے تھے۔ ان کو تو چاہیے تھا کہ عہدِ نبوی ہی میں اس مسئلہ کو اٹھاتے اور اپنے نورِ دیدہ کو اپنی فرزندی میں لے لیتے یا شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اس کا اظہار کرتے تاکہ شرع کے مطابق اس غریب کا نسب ثابت ہو جاتا۔ یہ عجیب نکاح ہے جس کا نہ ناکح کو پتہ ہے نہ منکوحہ کو، نہ خود اس لڑکے کو جو اس نکاح سے پیدا ہوا بس ایک مؤلف کو معلوم ہے۔ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ جو زیاد کے ماں جائے بھائی تھے اور جن کے متعلق خود مؤلف کو اعتراف ہے کہ

"ان کو صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا اور وہ اپنے کو مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے"

ان کی تصریح تو اس بارے میں یہ ہے کہ

"خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ سمیہ نے کبھی ابو سفیان کی صورت بھی دیکھی ہو" (الاستیعاب)

مگر مؤلف کو سمیہ سے حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے نکاح پر اصرار ہے، جو بات مؤلف کو معلوم ہے اگر خود یزید یا زیاد کو معلوم ہو جاتی تو نہ یزید زیاد کو اس طرح برسرِ عام ذلیل کرتا اور نہ زیاد یہ طعنہ سن کر اس طرح سٹپٹا جاتا بلکہ ایسا دندان شکن جواب دیتا کہ یزید دم بخود ہو کر رہ جاتا۔ بہرحال اس واقعہ سے یزید کی شرافت کا حال کھلا کہ جس کو چچا بنایا اس کے ساتھ اس طرح بدتمیزی سے پیش آیا۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) [۱] "ولاء" کا ترجمہ یہاں مؤلف نے صحیح نہیں کیا۔ یہاں "ولاء" کے لفظ سے مراد وہ ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔

بن عبید الی حرب بن امیۃ	گھس اور خدمت کاتب) سے منبر پر حاکم و گورنر کی حیثیت میں)
فقال معاویۃ لہ اجلس	پہنچایا اور زیاد فرزند غلام[1] سے حرب بن امیہ کے اخلاف میں شامل
فداک ابی وامی (ص ۲۲۸	کیا (تو پھر تم کیا دوں کی لیتے ہو) حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر
ج ۸ البدایہ والنہایہ)	بیٹے سے کہا بس اب بیٹھ جاؤ تم پر میرے ماں باپ قربان۔

(خلافت معاویہ ویزید۔ ص ۲۹۰ تا ۲۹۲ طبع دوم وص ۴۰۲ تا ۴۰۴ طبع سوم)

یہ ہے حد درجہ متواضع و حلیم، سنجیدہ و متین، خود بینی و تکبر سے مبرّا ایک سعادتمند بھتیجے کا کردار اپنے عم بزرگوار کے ساتھ۔ اور چچا جان پر یزید کے ان جملوں کا جو اثر ہوا وہ خود مؤلف نے بیان کر دیا ہے کہ" زیاد ٹپٹا کے رہ گئے"

زیاد کی جس حسن کارگزاری کا ابھی ذکر آیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

"حضرت معاویہؓ اس کے بعد تقریباً بیس سال تک مسند خلافت پر متمکن رہے اور بے نظیر حسن تدبر سے تمام فتنہ پرورانہ سرگرمیوں کو دور کر کے ہر خطہ مملکت میں امن و امان کو بحال کیا۔ سب سے زیادہ ابتر حالت شرقی ممالک کی تھی، وہاں کا نظم و نسق حکومت درست کرنے کے لئے اپنے سوتیلے بھائی امیر زیاد کو متعین کیا جو حضرت علیؓ کے زمانے سے گورنر فارس تھے اور حسن[2] انتظام کی بدولت ایرانی رعایا ان کو نوشیروان ثانی کہتی تھی[3]۔ (ص ۲۸۵ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۸ء مقالہ ایڈورڈ تھامس) اپنے بھائی کی طرح امیر زیادؓ بحیثیت مدبر و منتظم و حکمران عظیم شخصیت کے حامل تھے، مفسدین کے لئے درشت مزاج امن پسندوں کے لئے نرم خو۔" (خلافت معاویہ و یزید ص ۳۳۸ طبع دوم و ۴۷۹ طبع سوم)

۱ہ مؤلف کی تحقیق علمی کا یہ عالم ہے کہ آپ نے لفظ عبید کا بھی ترجمہ فرما دیا ہے جو کہ زیاد کے باپ کا نام ہے پھر لطف یہ کہ عبید لفظ مصغر ہے اور ترجمہ میں تصغیر کی رعایت نہیں ترجمہ ہی کرنا تھا تو غلاماً لکھتے۔ سچ ہے ع عیب کردن را ہنر باید۔

۲ہ جب زیاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے گورنر فارس تھا تو یزید کا اس کو یہ طعنہ دینا کہ ہم نے تجھ کو قلم کی گھس گھس اور خدمت کاتب سے منبر پر حاکم و گورنر کی حیثیت میں پہنچا دیا۔" دروغ گویم بروئے تو کا مصداق نہیں تو کیا ہے۔

۳ہ یہ ان میل بے جوڑ بات مؤلف سا بے لاگ محقق ہی کہہ سکتا ہے کہ" زیاد حضرت علی کے زمانے سے گورنر فارس تھے اور حسن انتظام کی بدولت ایرانی رعایا ان کو نوشیروان ثانی کہتی تھی" مگر پھر بھی "سب سے زیادہ ابتر حالت شرقی ممالک کی تھی" کہ جن میں فارس داخل ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"ملّت کی سربراہی اپنے وقت میں جیسی آل ابوسفیان رضؓ کی کامیاب رہی اس کا ثبوت کتب تاریخ کے علاوہ آثار قدیمہ سے بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ خلافت میں نہیں لیکن کاروبارِ خلافت اور انتظامِ مملکت کی بہترین انجام دہی میں (نیز داخلی فتنوں کے سدباب میں[1]) حضرت معاویہؓ کے سوتیلے بھائی امیر زیادؒ اور ان کی اولاد کا ممتاز حصہ رہا حضرت حسینؓ کے واقعہ حزن انگیز میں امیر ابن زیاد کو متہم کیا جاتا ہے لیکن بے لاگ تحقیق میں ان کا کوئی قصور ثابت نہیں ہوتا۔"[2] (ص ۳۴۹ و ۳۵۰ طبع دوم و ص ۲۹۲ طبع سوم)۔

یزید کے حلم وکرم کے دو نمونے

یزید کے حلم وکرم کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے ان اشعار کو پڑھئے جو مؤلف نے "حکومت کا نرم رویہ" کے زیر عنوان اس تمہید کے ساتھ درج کئے ہیں :-

"مکہ میں حضرت حسینؓ چار مہینے سے زیادہ عرصے تک مقیم رہے اور اس تمام مدت میں عراقیوں کی

---

[1] طبع سوم میں بین القوسین الفاظ کو نکال دیا ہے۔

[2] مؤلف کو زیاد اور اس کے بیٹے عبیداللہ سے اس لئے عقیدت ہے کہ ان دونوں باپ بیٹوں نے آلِ علیؓ اور محبانِ اہل بیت پر وہ مظالم ڈھائے ہیں کہ خدا کی پناہ، مؤلف کے ممدوح امیر زیاد کے متعلق حافظ ابن حبان صاحب الصحیح کے کتاب الضعفاء میں یہ الفاظ ہیں :-

ظاهر أحواله المعصية وقد أجمع أهل العلم على ترك الاحتجاج بمن كان كذلك (میزان الاعتدال ترجمہ زیاد بن ابیہ)

اس کے ظاہری حالات معصیت کے ہیں اور اہل علم کا اتفاق ہے کہ جو ایسا ہو اس کی روایت سے حجت پکڑنا متروک ہے

اور حافظ ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان میں رقمطراز ہیں :-

لم ينقل انه رأى النبي صلى الله عليه وسلم فهو من نمط مروان بن الحكم والمختار بن ابي عبيد، والعجب ان هؤلاء الثلاثة أسنانهم[ع] متقاربة وكذا نسبتهم الى الجور في الحكم وكل منهم ولي الامرة، وزاد مروان انه ولي في آخر عمره الخلافة (ترجمہ زیاد بن ابیہ)

یہ منقول نہیں کہ زیاد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو، پس یہ بھی مروان بن الحکم اور مختار بن ابی عبید کی طرح ہوا اور یہ عجیب بات ہے کہ ان تینوں کی عمریں بھی قریب قریب ہیں اور اسی طرح اپنے دورِ حکومت میں جور وستم کی نسبت میں بھی (ملتے جلتے) ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو امارت ملی ہے۔ اور مروان اس حیثیت سے بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنی آخری عمر میں متولی خلافت بھی ہوا۔

[ع] لسان المیزان کے مطبوعہ نسخہ میں اسنانهم کی بجائے انسابهم غلط طبع ہوگیا ہے۔

تحریرات اور ان کے وفود آتے جاتے رہے۔ خروج کی تیاریاں ہوتی رہیں لیکن حکومت کی جانب سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا نہ ان کی نگرانی ہوئی۔ نہ عراقیوں کو ان کے پاس آنے جانے سے روکا گیا حتیٰ کہ نہ اسلحہ وغیرہ کی فراہمی پر کوئی قدغن کیا گیا۔ قوی آثار سے ظاہر ہے کہ خود امیر یزیدؒ نے ان کو مخاطب کیا اور اللہ کا عہد یاد دلایا جیسا کہ اس قطعہ اشعار میں صاف اشارہ ہے جو امیر موصوف نے باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لیے لکھ کر بھیجے تھے[1]۔ اس قطعۂ اشعار کو شیعہ مورخ طبری نے بھی

---

[1] مؤلف نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالتے ہی ہر شخص سمجھ جائے گا کہ ان اشعار میں یزید کا روئے سخن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف ہے کیونکہ وہ ان ہی کا نام لے رہا ہے اور ان کی ہی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کر رہا ہے لیکن بے لاگ محقق فرماتے ہیں کہ "یزید نے یہ اشعار باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لئے لکھ کر بھیجے تھے" یزید کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے بھی مؤلف نے اپنے اسی خیال کا اظہار کیا ہے حالانکہ جن کتابوں کا وہ حوالہ دیتے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ تصریح نہیں کہ یہ "اشعار باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لئے لکھے گئے تھے" نہ طبری نے یہ لکھا ہے، نہ ابن کثیر نے، نہ ناسخ التواریخ کے غالی مؤلف نے (جس کا صفحہ مؤلف نے ۱۶۲ غلط لکھا ہے صحیح ۱۲۸ ہے) بلکہ البدایہ والنہایہ اور ناسخ التواریخ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ یہ اشعار یزید نے اس خط میں لکھے تھے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ مکرمہ میں آمد پر اس نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو روانہ کیا تھا۔ لطف یہ ہے کہ بے لاگ محقق خود بھی اپنے قلم سے صرف تین چار صفحے پہلے یہی واقعہ تحقیق درج کر آئے ہیں چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"امیر یزید کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی کہ عراق کے لوگ حضرت حسینؓ کو طلب خلافت پر آمادہ کر رہے ہیں تو انہوں نے حضرت ابن عباس رضہ کو جو اس وقت خاندانِ بنی ہاشم کے بزرگ اور سربراہ تھے تحریر بھیجی کہ حسین رضہ کو تفرقہ ڈالنے کی کارروائی سے روکیں۔

وکتب یزید بن معاویۃ الی ابن العباس	اور یزید ابن معاویہؓ نے ابن عباسؓ کو یہ خط لکھا
یخبرہ بخروج الحسین الی مکۃ واحسبہ	جس میں انھیں مطلع کیا کہ حسینؓ (مدینہ سے نکل کر)
قد جاءہ رجال من اھل المشرق فمنوہ	مکہ کو چلے گئے ہیں اہل مشرق (یعنی عراقیوں) میں سے
الخلافۃ وعندک خبر وتجربۃ فان	چند آدمی ان کے پاس آئے ہیں اور انھیں حصولِ
کان قد فعل فقد قطع راسخ القرابۃ	خلافت پر آمادہ کیا ہے آپ کو حالات کا علم اور تجربہ
وانت کبیر اھل بیتک والمنظور	(سابقہ واقعات کا) ہے اگر واقعی ایسا ہے تو انھوں نے
الیہ فاکففہ عن السعی فی الفرقۃ۔	(یعنی حسینؓ نے) قرابت کے مضبوط رشتہ کو قطع کر دیا ہے
(ص ۱۶۲ ج ۸ البدایہ والنہایہ)	آپ اہلِ بیت کے بزرگ ہیں اور حسینؓ کے پسندیدہ شخص ہیں
	اس لئے آپ انھیں تفرقہ ڈالنے سے روکیں۔

(باقی برصفحہ آئندہ)

جلد ۶ ص ۴۱۹ پر درج کیا ہے۔ اور دیگر مورخین خصوصاً علامہ ابن کثیر نے بھی ص۱۶۴ جلد ۸ میں اور تاریخ التواریخ کے غالی مؤلف نے ص۱۷۱ ج ۶ کتاب دوم میں دیا ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے :۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت ابن عباسؓ نے اس کے جواب میں جو تحریر امیر یزیدؒ کو بھیجی تھی جسے شیعہ مورخین نے مسخ کر کے بیان کیا ہے اس میں لکھا تھا :۔

انی لارجان لایکون خروج الحسین	مجھے امید ہے کہ حسینؓ کوئی ایسا خروج نہ کریں گے جو
لامر تکرھہ ولست ادع النصیحۃ	برائی کا موجب ہو اور میں انھیں اس بات کی نصیحت
لہ فی کل ما تجتمع بہ الالفۃ وتطفیٔ	کرنے میں کوتاہی نہ کروں گا جس سے الفت قائم رہے
بہ النائرۃ (ص۱۶۴ ج ۸ البدایہ والنہایہ)	اور ہنگامہ کی آگ بجھ جائے۔

دیگر مورخین کے علاوہ تاریخ التواریخ کے غالی مؤلف میرزا محمد تقی سپہر کاشانی نے "ذکر نگارش نامہ یزید بعبداللہ بن عباسؓ در امر حسین بن علیؓ" کے عنوان سے جو مکتوب امیر المومنین یزیدؒ سے منسوب کر کے درج کیا ہے اس میں بھی حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور حضرت حسینؓ کے مدینہ سے مکہ چلے جانے کا ذکر کرتے ہوئے تقریباً وہی عبارت موجود ہے جو علامہ ابن کثیر وغیرہ مورخین نے لکھی ہے ......

مکتوب کے آخر میں امیر موصوف کے وہ اشعار بھی درج کئے ہیں جو آئندہ اوراق میں قطعہ اشعار امیر یزیدؒ کے عنوان سے آپ مطالعہ کریں گے اور اسی کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب سے جواب خط بھی درج ہے جس کی ابتدائی سطور میں یہ لکھا ہے کہ حسینؓ کے مدینہ چھوڑ کر مکہ چلے آنے کا سبب یہ ہوا کہ مدینہ میں جو عمال تمہارے ہیں انھوں نے ناشائستہ کلمات ان کے بارے میں کہے "وعجلوا علیہ بالکلام الفاحش فاقبل الی حرم اللہ مستجیراً بہ" اس لئے وہ بیت اللہ میں پناہ لینے چلے آئے ......

یہ مکاتیب بیّن ثبوت ہیں عراقی سبائیوں کی ریشہ دوانیوں کے جو انھوں نے حضرت حسینؓ کو حصول خلافت پر آمادہ کرنے کے لئے شروع کیں، اور یہ خطوط جو شیعہ مورخین نے درج کئے ہیں مسکت ثبوت ہیں اس بات کا کہ حضرت حسینؓ کا اقدام محض سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے تھا۔ (ص ۶۸ تا ۷۱ طبع دوم و ص ۸۷ تا ۹۰ طبع سوم)

مؤلف کو ان خطوط کی صحت پر اس درجہ وثوق ہے کہ وہ ان کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف "بیّن ثبوت" اور "مسکت ثبوت" مانتے ہیں۔ ان خطوط میں کیا ہے یزید کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر الزام اور وہ بھی کسی یقین کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے خیال وگمان پر چنانچہ خود اس کے الفاظ ہیں کہ

واحسبہ قد جاءہ رجال من اھل	میں گمان کرتا ہوں کہ ان کے پاس اہل مشرق میں سے کچھ لوگ
المشرق فمنوہ الخلافۃ۔	آئے ہیں جنھوں نے ان کو خلافت کی توقع دلائی ہے عہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

عہ یہاں سے طبع سوم میں اضافہ ہے۔ عہ مؤلف نے احسبہ کا ترجمہ یکسر سے چھوڑ دیا ہے۔

یا أیها الراکب الغادی لطیبة　　علی عذافرة فی سیرها قحم

اے سوار جو طیبہ (مدینہ) کی طرف ایسی اونٹنی پر جا رہا ہے جس کی چال میں بانکپن ہر کہ تھکاوٹ کے باوجود قدم جم کر پڑتا ہے

أبلغ قریشاً علی شحط المزار بها　　بینی وبین حسین الله والرحم

میرا پیغام قریش کو پہنچا دے کیونکہ ان سے ملنے کو فاصلہ بہت ہے کہ میرے اور حسین کے درمیان اللہ کا اور رشتہ داری کا واسطہ ہے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) یہ خط کس سلسلہ میں لکھا گیا تھا وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے:۔

وکتب یزید بن معاویة الی ابن عباس　　اور یزید بن معاویہ نے ابن عباس کو مکہ خط لکھا جس میں انھیں

یخبرہ بخروج الحسین الی مکة　　مطلع کیا کہ حسین (مدینہ سے نکل کر) مکہ کو چلے گئے ہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ میں آنا غضب ہو گیا یزید کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اب چین کہاں، اطلاع کے ساتھ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نقل و حرکت کی تفتیش اور پھر اس پر تشویش شروع ہو گئی فوراً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خط بھیجا گیا قرابت کا واسطہ دلایا گیا اور انھیں لکھا گیا کہ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو فہمائش کریں آخر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے صفائی کرنی پڑی اور انھوں نے یزید کو لکھا کہ "گھبرانے کی بات نہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مکہ آجانا کسی ایسے امر کی بنا پر نہیں جو تمہیں ناگوار ہو" فرماتے ہیں:۔

وانی لارجوان لا یکون خروج الحسین　　مجھے امید ہے کہ حسین کا مدینہ سے نکلنا کسی ایسے

لامر تکرهه　　امر کی بنا پر نہ ہوگا جو تمہیں ناگوار ہو۔

مؤلف نے اپنی قابلیت سے اس عبارت کا یہ ترجمہ فرمایا ہے کہ

"مجھے امید ہے کہ حسینؓ کوئی ایسا خروج نہ کریں گے جو برائی کا موجب ہو۔"

"جو برائی کا موجب ہو" معلوم نہیں کن الفاظ کا ترجمہ ہے پھر خط میں ذکر خروج الحسین الی مکة (مدینہ طیبہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ معظمہ کی طرف نکلنے کا ذکر) ہے جواب خط میں بھی اسی خروج کا تذکرہ ہے مگر مؤلف نے بلند پروازی دکھائی وہ ابھی سے مکہ معظمہ سے عراق کی طرف خروج کی سوچنے لگے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب نامہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس خروج کی وجہ بھی بتلا دی ہے کہ

وعجلوا الیه بالکلام الفاحش فأقبل　　مدینہ میں تمہارے عمال نے ناشائستہ کلمات ان سے

الی حرم الله مستجیراً به　　کہے اس لئے وہ بیت اللہ میں پناہ لینے چلے آئے۔

اب اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان صحیح ہے تو صورتِ حال بالکل واضح ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ابھی ابھی مکہ معظمہ میں قدم رکھا ہے، عمالِ یزید کی بداطواریوں سے تنگ آکر وہ حرم الٰہی میں پناہ لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں کہ یزید نے الزام تراشی شروع کر دی (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

وموقف بفناء البیت انشدہ — عہد الالہ وما ترعی بہ الذمم

اور صحنِ حرم میں کھڑے ہوکر کہی ہوئی بات ہے۔ ہیں انھیں اللہ کا عہد اور ہر اس چیز کی یاد دلاتا تھا جو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت قابل لحاظ ہوتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اس کو تو خدشہ لگا ہوا ہے کہ کہیں عراقی ان کی حمایت پر کھڑے نہ ہو جائیں اس لئے حفظِ ما تقدم کے طور پر اندیشہ کا اظہار شروع کر دیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جہاں اس سلسلہ میں خط لکھا ساتھ ہی نظم میں کھلی تہدید بھی کر دی کہ اگر ہماری اطاعت سے ذرا سرتابی کی گئی تو پھر خیر نہیں اپنی نعشوں کو عقاب و کرگس کا طعمہ بنانے کے لئے تیار ہو جاؤ، مولف بھی یزید کی لے میں لے ملانے لگے اور ابھی سے خروجِ عراق کی تمہیدیں جمانے لگے حالانکہ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جوابِ خط سے ظاہر ہے یہاں ابھی عراق جانے کا ذکر فکر کچھ بھی نہیں اب ناظرین خود فیصلہ فرمالیں کہ یہ مکاتیب کس بات کا بیّن ثبوت ہیں عراقی سبائیوں کی ریشہ دوانیوں کا کہ جس کا ذکر یزید نے محض اپنے گمان کی بنا پر کیا ہے اور اس امر کا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام محض سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے تھا جیسا کہ مؤلف کو دعویٰ ہے یا اس بات کا کہ مکہ معظمہ میں ان کی آمد یزیدی عمال کی حرکاتِ ناشائستہ کی بنا پر تھی اور وہ حرمِ الٰہی میں محض پناہ لینے کی غرض سے آئے تھے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے یہ مولف کی غایت سعادتمندی ہے کہ انھیں اپنے دادا صحابی رسول اللہؐ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کا بالکل اعتبار نہیں اور یزید کا کہا ان کے نزدیک پتھر کی لکیر ہے نیز یہ بات بھی سوچنے کے لائق ہے کہ یزید کی اس خط و کتابت میں بے لاگ محقق کو اپنے امیر المؤمنین کے بارے میں ذرا دیر کے لئے بھی یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ اس کا یہ اقدام محض اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی خاطر تھا لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق انھوں نے جھٹ سے یہ فتویٰ جڑ دیا۔

خیر یہ بحث تو جملہ معترضہ کی طرح بیچ میں آ گئی عرض کرنا یہ ہے کہ مؤلف نے تحریر بالا میں جیسا کہ خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہے تسلیم کر لیا ہے کہ "یزید کا یہ قطعۂ اشعار اس کے مکتوب کے آخر میں درج تھا" اس لئے اب یہ لکھنا کہ "یہ اشعار باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لئے لکھے گئے تھے" کس قدر غلط ہے، کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ معظمہ میں آمد اور اہلِ مدینہ کے یزید کے خلاف صف آرا ہونے میں تین سال سے زائد کا عرصہ ہے۔ خود مؤلف نے لکھا ہے کہ

"حادثۂ کربلا کے بعد جو ۱۰ محرم ۶۱ھ کو پیش آیا تھا تین برس تک یعنی ۲۸ ذی حجہ ۶۳ھ تک عالمِ اسلام میں کسی جگہ کوئی ہنگامہ بپا نہ ہوا" (ص ۳۶۸ طبع سوم)

"حادثۂ کربلا کے بعد تین سال کے عرصہ تک کسی جگہ کسی قسم کا کوئی ہنگامہ یا شورش نہیں ہوئی"

(ص ۲۶۸ طبع دوم)

اور جب یہ ثابت ہوا کہ یہ اشعار اس وقت لکھے گئے تھے جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ میں مقیم تھے اور ان اشعار میں وہ سب دھمکیاں موجود ہیں جو ایک باجبروت بادشاہ اپنے مخالفین کو دیا کرتا ہے تو اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا وہ اندیشہ بالکل صحیح نکلا جس کا ذکر مؤلف نے اپنی کتاب میں اس طرح کیا ہے کہ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

عنفتم قومکم فخراً بأمکم   أمّ حصان لعمری برة کرم

تم اپنی ماں پر فخر کرکے اپنی قوم کے سامنے ناک چڑھاتے ہو۔ ہاں وہ ماں ایسی ہی ہیں پاک دامن اور میری جان کی قسم بڑی نیک کردار اور عزت والی۔

ھی التی لا ید انی فضلھا أحد   بنت النبی وخیر الناس قد علموا

وہ ایسی ہیں کہ ان کے شرف کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ نبی صلعم کی بیٹی اور دنیا جانتی ہے کہ سب سے اچھی۔

وفضلھا لکم فضل وغیرکم   من قومکم لھم من فضلھا قسم

ان کی فضیلت میں تمہاری (حسینؓ) فضیلت ضرور ہے۔ مگر تمہارے علاوہ بھی تمہاری قوم میں ایسے لوگ ہیں جو ان کے شرف سے بہرہ مند ہیں۔

انی لاعلم او ظنا کعالمه   والظن یصدق احیانا فینتظم

میں جانتا ہوں یا جاننے والی کی طرح گمان کرتا ہوں کیونکہ بسا اوقات گمان سچا نکلتا ہے اور بات پوری ہو کر سامنے آجاتی ہے

ان سوف ینزلکم ما تطلبون بھا   قتلی تھاداکم العقبان والرخم

کہ عنقریب تم پر (اے باغیانِ مدینہ)[1] وہی چیز نازل ہوگی جو اس بغاوت سے تم حاصل کرنا چاہتے ہو یعنی مقتولوں کی لاشیں جو تمہاری طرف سے عقابوں اور گدھوں کے لئے سامانِ ضیافت ہوں گی۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) فرزدق شاعر سے ایک سوال منسوب کرکے غالی راویوں نے حضرت حسینؓ کے منہ سے تعجیل سفر کی وجہ یہ بیان کرائی ہے:۔

سوال فرزدق   ما أعجلك عن الحج؟   ایسی جلدی کیا پڑی ہے کہ آپ حج چھوڑ کر جا رہے ہیں
جواب حسینؓ   لولم أعجل لاخذت   میں ایسی جلدی نہ کرتا تو گرفتار کر لیا جاتا۔

(ص۲۱۸ ج ۶ طبری، ص۱۶۶ ج ۸ البدایہ والنہایہ)

(خلافت معاویہ و یزید۔ ص ۱۱۳ و ۱۱۴ طبع دوم و ص ۱۳۵ طبع سوم)

مولف کو یزید کے حلم و کرم کو دیکھئے اس واقعہ کی صحت سے انکار ہے لیکن ان اشعار کے تیور یزید کی سفا کی اور قساوت کو بتلائے دے رہے ہیں۔

(حاشیہ صفحۂ ھذا) [1] یہ "باغیانِ مدینہ" کے الفاظ اسی غلط مفروضہ پر مبنی ہیں کہ یہ خط باغیوں کو لکھا گیا تھا۔

یا قومنا لا تشبوا الحرب اذ خمدت   وامسکوا بحبال السلم واعتصموا

اے میری قوم جنگ کی آگ بجھ چکی اسے مت بھڑکاؤ اور صلح کی رسی کو مضبوط پکڑو اور اسی پر قائم رہو۔

لا ترکبوا البغی ان البغی مصرعة   وان شارب کاس البغی یتخم

بغاوت کا ارتکاب مت کرو بغاوت پچھاڑ دینے والی ہے اور جام بغاوت پینے والا اسے ہضم نہیں کر سکتا۔

قد جرب الحرب من قد کان قبلکم   من القرون وقد بادت بھا الامم

لڑائی کا تجربہ انھیں ہو چکا جو تم سے پہلے گزر چکے۔ اقوام عالم کے لئے یہ بھولی بسری باتیں ہو چکیں

فانصفوا قومکم لا تھلکوا بذخا   فرب ذی بذخ زلت بہ القدم

اپنی قوم کے حق میں عدل کی راہ اختیار کرو اور بے جا حرکتوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو کیونکہ اکثر بے جا حرکتوں سے ہی آدمی ٹھوکر کھاتا ہے۔

امیر یزید رضؓ کے مندرجہ بالا قطعہ اشعار سے اس وقت کے احوال کا بہت کچھ صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے تیسرے شعر کے مضمون سے ثابت ہے کہ حضرت حسینؓ نے بھی امیر المومنین معاویہؓ کی زندگی میں امیر یزیدؒ کی ولیعہدی کی بیعت کی تھی۔ وہ مضمون شعر کا یہ ہے: "اور صحن حرم میں کھڑے ہو کر کہی ہوئی بات ہے میں انھیں اللہ کا عہد اور اس چیز کی یاد دلاتا تھا جن کا ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت لحاظ رکھا جاتا ہے۔[1] ان الفاظ سے صاف اشارہ اسی طرف ہے۔ آزاد اور بے لاگ مورخین نے حضرت حسینؓ کے اقدام خروج کے سلسلے میں اسی بات کو بیان کیا ہے۔" (ص ۴۳ تا ۴۶ طبع دوم و ص ۹۲ تا ۹۴ طبع سوم)

[1] یوں تو مؤلف اگرچہ عام طور پر ترجمہ غلط ہی کیا کرتے ہیں لیکن یہاں تو کمال ہی کر دکھایا وہ ترجمہ فرمایا ہے کہ جس سے مطلب بالکل خبط ہو کر رہ گیا۔ لغت دانی کی حد ہو گئی موقف کا ترجمہ کیا ہے "کھڑے ہو کر کہی ہوئی بات ہے" حالانکہ یہ مصدر میمی ہے بمعنی وقوف کے اور معطوف ہے الرحم پر اس لئے اس کا تعلق دوسرے شعر کے آخر مصرعہ سے ہوگا اور ترجمہ یوں کیا جائے گا۔

"میرے اور حسین (رضی اللہ عنہ) کے درمیان اللہ کا اور رشتہ داری کا، اور بیت اللہ کے حوالی میں ان کے ٹھیرے رہنے کا تعلق آڑے ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ خدا کا خوف اور رشتہ داری کا تعلق اور حرم الٰہی میں ان کا قیام یہ تین چیزیں ہیں جو میرے اور ان کے درمیان حائل ہیں ورنہ میں ان کو ان کے کئے کا وہ مزہ چکھاتا کہ انھیں معلوم ہو جاتا (باقی بر صفحہ آئندہ)

ان اشعار میں یزید نے جس حلم وکرم کا مظاہرہ کیا ہے اس کا جواب نہیں وہ اپنے مخاطب (سبطِ پیمبر) سے صاف صاف کہہ رہا ہے کہ "عنقریب تم پر وہی چیز نازل ہوگی جس کے تم طلبگار ہو اور تم اس طرح مقتول پڑے ہوگے کہ عقاب وکرگس تمہاری لاشوں کو آپس میں بطور ہدیہ بانٹ رہے ہوں گے۔" چنانچہ ان اشعار میں جو کہا گیا تھا کربلا اور حرّہ میں وہی کر دکھایا گیا۔ حرّہ کے متعلق تو خود مؤلف کو اعتراف ہے کہ یزید نے

"امیر عسکر سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مدینہ کے لوگوں کو تین دن کی مہلت دینا مان جائیں تو خیر ورنہ لڑائی کرنا، جب غلبہ پا جاؤ تو باغیوں کا مال اور روپیہ اور ہتیار اور غلہ (من مال او رقة او السلاح او طعام فهو للجند) یہ لشکریوں کے لئے ہے۔ بلاذری اور طبری میں ان ہی اشیاء کے لے لینے کے الفاظ ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں" (خلافت معاویہ و یزید ص ۳۷۹ طبع سوم)

تمام فقہاءِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ باغیوں کے مال واسباب سے تعرض نہ کیا جائے کیونکہ اہل سنت کے خلیفۂ راشد امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے باغیوں کے مال واسباب سے تعرض نہیں کیا تھا اگر مؤلف کے خلیفۂ راشد اور امیر المومنین یزید کے حلم وکرم کا تقاضا ہے کہ باغیوں پر غلبہ پا جانے کے بعد ان کا مال، روپیہ، ہتھیار اور غلہ سب لشکریوں کے لئے ہے۔ معلوم نہیں یزید نے یہ مسئلہ کہاں سے نکالا، کتاب وسنت میں تو اس کا پتہ نہیں ہے۔ جناب مؤلف کی یہ ستم ظریفی بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ یزید کے اس ظالمانہ حکم کے باوجود ان کی بے لاگ تحقیق میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) مجھ سے بیعت نہ کرنا کیسا ہوتا ہے۔ مولف نے موقف کا ایسا خود ساختہ ترجمہ کرکے کہ جس کو سن کر ہر نحوی کو وجد آجائے اس سے یہ تاریخی مسئلہ نکالا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے صحن حرم میں ولی عہدی کی بیعت کرلی تھی۔ اگر اگلے مورخین بھی مولف کی طرح عربی زبان کی کچھ شدبد رکھتے اور بے لاگ محقق ہوتے تو اس نادر تاریخی تحقیق کو ضرور اپنی تصانیف میں جگہ دیتے۔

اور یہ جو یزید نے کہا ہے کہ وانشده عهد الاله وما ترعى به الذمم تو یہاں وہ واعظ ناصح بن گیا ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خدا کا عہد اور اپنی ذمہ داریاں یاد دلا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ذمہ داریاں سمجھئے اور خدا کے عہد یعنی امیر وقت کی اطاعت کا خیال رکھئے۔

(حاشیہ صفحۂ ھذا) [۱] آٹھویں شعر کا صحیح ترجمہ۔

"لوٹ کھسوٹ وغیرہ کی سب روایتیں سبائیوں کی تراشیدہ ہیں" (ص ۲۷۲ طبع دوم)

شاید باغیوں نے یہ سب چیزیں خوشی خوشی لاکر لشکریوں کو خود نذر کردی ہوں گی۔ مؤلف نے یہ نہیں بتایا کہ پھر ان بے سروسامان لوگوں کا جن کی ہر چیز چھین کر لشکریوں کے حوالہ کردی گئی تھی انجام کیا ہوا اور یزید کے حلم وکرم نے ان بیکسوں کا مداوا کس طرح کیا۔

یزید کا ذوق موسیقی مؤلف نے یزید کے علم وفضل کے بڑے گن گائے ہیں لیکن ان مستشرقین اور بے لاگ محققین نے اس کی قرآن فہمی، حدیث دانی، فقہ واجتہاد اور علم مغازی وسیر کا ذکر کرنے کی بجائے اس سلسلے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا کہ

"وہ خود شاعر تھا، موسیقی کا ذوق رکھتا تھا، اہلِ ہنر اور شعرا کا قدردان تھا، ادب وآرٹ کا مربی اور سرپرست تھا"

"ادب وآرٹ" کے الفاظ مستشرقین کے یہاں اپنے اسی وسیع معنی میں بولے جاتے ہیں جس معنی میں کہ آج کل یورپ میں ان کا رواج ہے، مؤلف نے یزید کی آرٹ نوازی کا ایک دلچسپ قصہ اپنی کتاب میں "منصف مزاجی" کے زیرعنوان درج کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔ فرماتے ہیں۔

"منصف مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ ذاتی معاملات میں بھی امیر یزید دامنِ انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، ابن کثیر نے سلامہ نام ایک کنیز کا واقعہ بیان کیا ہے جو مدینہ منورہ کی رہنے والی، حسن وجمال میں یکتا اور ہمہ صفت موصوف تھی۔ قرآن شریف اچھی قرارت سے سناتی شاعرہ اور مغنیہ تھی حضرت حسان بن ثابت کے فرزند عبدالرحمٰن نے جو خود بھی شاعر تھے اور جن کا ذکر ایک قصہ میں اوپر گذر چکا۔ اس کنیز کی امیر یزید سے بہت کچھ ثنا وصفت کرکے اس کی خریداری پر راغب کیا۔

ودلہ علی سلامتہ وجمالھا وحسنھا و	اور انھیں (امیر یزید کو) سلامہ اور اس کے حسن وجمال
فصاحتھا وقال لا تصلح الا لک	وفصاحت کی طرف رغبت دلائی اور کہا کہ اے
یا امیر المؤمنین وان تکون من	امیر المؤمنین یہ کنیز سوائے آپ کے اور کسی کے لائق نہیں
سمارک (ص ۲۴۲ ج ۸ البدایہ والنہایہ)	خواہ آپ اسے قصہ خوانی ہی کے لئے رکھ لیں۔[1]

[1] حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

کنیز کے آقا سے خریداری کا معاملہ طے کر لیا گیا۔ کنیز مذکورہ مدینہ سے دمشق آکر داخل حرم کی گئی اور دوسری کنیزوں پر اسے فوقیت حاصل ہو گئی۔[1] لیکن جب یہ راز افشا ہوا کہ یہ کنیز اور مدینہ منورہ کا ایک شاعر احوص بن محمد ایک دوسرے کے دام محبت میں گرفتار ہیں امیر یزید نے احوص کو جو دمشق میں موجود تھا نیز سلامہ کو مواجہ میں طلب کر کے تصدیق کی ان دونوں نے فی البدیہہ اشعار میں اقرار محبت کیا۔ سلامہ نے کہا کہ شدید محبت مثل روح کے میرے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے تو کیا اب روح اور جسم میں مفارقت ہو سکے گی۔

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ؎ یہ ترجمہ غلط ہے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "اے امیر المومنین یہ تو صرف آپ کے لائق ہے اور آپ کے داستان سراؤں میں داخل ہونے کے" معلوم ہوا امیر المومنین کے پر لطف مشاغل زندگی میں قصہ کہانیوں کے سننے کا دلچسپ مشغلہ بھی تھا اور اس کا اس درجہ اہتمام تھا کہ ان کے یہاں اس خدمت کی بجا آوری کیلئے داستان سراؤں کی ایک مستقل ٹولی موجود تھی جس میں صنف نازک کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ چنانچہ سلامہ کی خریداری کی اصل وجہ بھی اسی بزم کی رونق تھی۔ ظاہر ہے کہ امیر المومنین کا یہ مشغلہ بھی ادب و آرٹ کی سرپرستی ہی کے سلسلہ میں تھا۔

(حاشیہ صفحۂ ھذا) [1] یہاں مؤلف نے بیچ کی کڑی چھوڑ دی جو اس واقعہ کی اصل جان تھی اور وہ یہ ہے کہ سلامہ کے ولولۂ عشق میں احوص نے دمشق کی راہ لی اور یہاں آکر دربار سے تعلق پیدا کیا۔ یزید کی مدح میں قصائد کہے جس کی بدولت اسے خوب عروج نصیب ہوا۔ سلامہ کو جب اس کی آمد کا پتہ چلا تو ایک خادم کو اپنا ہمراز بنایا اور اسے کچھ دے دلا کر کسی طرح اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جس طرح بھی بن سکے وہ احوص کو لا کر ایک بار اس سے ملا دے، کمبخت خادم نے یزید کے پاس جا کر سارا راز فاش کر دیا۔ یزید کو تجسس ہوا اور اس نے اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے خادم کو کہہ دیا کہ سلامہ کا کہنا کر دے وہ جا کر احوص کو بلا لایا اور یزید چھپ کر کسی ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے اپنے حرم کی کارگزاری دیکھ سکے۔ ادھر مدت کے بچھڑے ایک دوسرے سے ملے تو حالت دگرگوں ہو گئی۔ سلامہ کی نظر جیسے ہی احوص پر پڑی زار و قطار رونے لگی۔ احوص کا بھی برا حال ہوا تھوڑی دیر تو اسی بیقراری میں گذری جب ذرا دل کو قرار آیا تو سلامہ نے کرسی منگوا کر باعزاز تمام احوص کو اس پر بٹھایا۔ اب سلسلۂ کلام شروع ہوا راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں گفتگوئے محبت نے طول کھینچا کہ اسی اثنا میں رات بیتی سحر ہو گئی، بزم محبت میں تفرقہ پڑ گیا دونوں جذبات الفت میں سرشار تھے۔ جدا ہونے لگے تو طرفین سے شاعری شروع ہو گئی جو اس وقت کے دلی کیفیات کی آئینہ دار تھی۔ احوص جیسے ہی وداع ہو کر باہر نکلا دھر لیا گیا۔ یزید نے شب کی سرگذشت پوچھی اور تشنہ کامان محبت نے جو عشق کے ہاتھوں مجبور تھے کچھ اس انداز سے اپنے جذبات کا اظہار کیا کہ یزید سا سنگدل بھی ان پر رحم کھائے بغیر نہ رہ سکا۔

❊

بصحۃ ذلك۔ (البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۲۳۵) اور چیزیں بھی بیان کی ہیں جن کی صحت کا اللہ ہی کو خوب علم ہے۔

یہ ہے یزید کے ادب و آرٹ کے مربی و سرپرست ہونے کی تفصیل، اب ظاہر ہے کہ یزید کی ان خوبیوں کی قدر جیسی اربابِ طرب و اہلِ نشاط کو ہو سکتی ہے بھلا زاہدانِ خشک کو کیا ہوگی۔ وہ اس ذاتِ شریف کو کیا پہچانیں۔ بقول باباجی

"ایک پابند رسوم دادہام ملا آپ کی بلند پایہ تاریخی تحقیق و ریسرچ کو کیا سمجھ سکتا ہے"۔ [1]

یزید کو اس دور میں یا تو "باباجی" نے سمجھا ہے جو ادب و آرٹ کے اتنے بڑے مربی ہیں کہ کیا مجال جو ان کے جیتے جی "انجمن ترقی اردو" سے کوئی مذہبی کتاب شائع ہو جائے اور ان کے مربی ادب ہونے میں بٹہ لگ جائے یا پھر جناب عباسی نے کہ جو بے لاگ تحقیق کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔

یزید کی صورت خود اپنے آئینہ میں

"کربلا کے المناک حادثہ کے کچھ عرصہ بعد جب حضرت محمد بن علیؓ (ابن الحنفیہ) دمشق تشریف لے گئے تھے امیر المومنین یزیدؒ نے پہلی ہی ملاقات میں حضرت حسینؓ کے واقعہ پر ان الفاظ میں ان سے اظہار تاسف و تعزیت کیا تھا۔

پھر یزیدؒ نے ابن الحنفیہؒ کو ملاقات کے لئے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر ان سے کہا۔

"حسینؓ کی موت پر خدا مجھے اور تمہیں اجر عطا کرے۔ بخدا حسینؓ کا نقصان جتنا تمہارے لئے ہے اتنا ہی میرے لئے بھی ہے اور ان کی موت سے جتنی اذیت تمہیں ہوئی ہے اتنی ہی مجھے بھی ہوئی ہے اگر ان کا معاملہ میرے سپرد ہوتا اور میں دیکھتا کہ ان کی موت کو اپنی انگلیاں کاٹ کر اور اپنی آنکھیں دیکر ٹال سکتا ہوں تو بلا مبالغہ دونوں ان کے لئے قربان کر دیتا گو کہ انھوں نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی اور خونی رشتہ کو ٹھکرا دیا تھا۔

تم کو ضرور معلوم ہوگا کہ ہم پبلک میں عیب جوئی حسینؓ کی کرتے ہیں بخدا یہ اس لئے نہیں کہ عوام [2]

[1] ملاحظہ ہو باباجی کا خط مؤلف کے نام جو طبع سوم میں سرورق کے بعد ان دونوں کی تصویروں کے ساتھ منسلک ہے کاش ان دونوں بزرگوں کے ساتھ خود ان کے بزرگ و ممدوح یزید کا بھی فوٹو ہوتا تو آرٹ کا پورا پورا مظاہرہ ہوتا۔ [2] مقام غور ہے جو شخص مرنے کے بعد حضرت ممدوح کی عیب جوئی سے نہ چوکے وہ زندگی میں ان کے لئے کیا خاک قربانی کرتا۔

حبًّا شدیدًا جری کالروح فی جسدی　　فهل یفرق بین الروح والجسد

امیر یزیدؒ نے یہ حال دیکھ کر سلامہ کو احوص کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا:۔

خذها یا احوص فهی لك، ووصله صلة　　اے احوص اب یہ سلامہ تمہاری ہے تم اسے لیلو

سفینہ (ص۲۳۲ ج ۸ البدایہ والنہایہ)　　پھر اسے اچھا انعام بھی عطا کیا۔

(خلافت معاویہؓ و یزید ص ۳۱۸ و ۳۱۹ طبع دوم و ۳۷۴ تا ۳۹۴ طبع سوم)

یزید کی اس انصاف پروری کی قدر موجودہ دور میں جیسی سینما کے پردہ پر ہو سکتی ہے اور کہیں نہیں ہو سکتی کیا اچھا ہوتا اگر مولف اس سلسلہ میں ایک فلمی کہانی سپرد قلم کر دیتے اور عوام کی نظروں میں بھی ان کے ہیرو کے چار چاند لگ جاتے۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن کثیرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ

وقد روی أن یزید کان قد اشتهر　　اور روایت کیا گیا ہے کہ یزید باجے گاجے، مے نوشی

بالمعازف وشرب الخمر والغنا والصید　　گانے بجانے، شکار کرنے، گانے والی چھوکریوں کے

واتخاذ القیان والکلاب والنطاح　　رکھنے، کتے پالنے اور مینڈھے ریچھ اور بندروں کے

بین الکباش والدباب والقرود وما　　لڑانے میں شہرت رکھتا تھا اور کوئی دن ایسا نہ گزرتا

من یوم الا یصبح فیه مخمورًا، وکان　　تھا کہ جس کی صبح کو وہ مخمور نہ اٹھے۔ وہ زین کسے ہوئے

یشد القرد علی فرس مسرجة بحبال　　گھوڑوں پر بندروں کو رسیوں سے باندھ کر انہیں

ویسوق به، ویلبس القرد قلانس　　ہانک دیتا تھا، بندروں کو اور اسی طرح نوخیز لڑکوں کو

الذهب وکذلك الغلمان، وکان یسابق　　سونے کی ٹوپیاں اڑھاتا تھا، گھوڑ دوڑ کرایا کرتا تھا۔

بین الخیل وکان اذا مات القرد حزن　　جب کوئی بندر مرجاتا تو اس پر غمگین ہوتا تھا۔ کہا جاتا

علیه وقیل ان سبب موته أنه　　ہے کہ اس کی موت کا سبب بھی یہی ہوا کہ ایک بندریا

حمل قردة وجعل ینقزها فعضته　　کو سوار کرا کر اسے نچا رہا تھا دفعتًا اس نے کاٹ کھایا

وذکروا عنه غیر ذلك، والله اعلم　　مورخین نے اس کے بارے میں ان باتوں کے علاوہ

میں خاندانِ علیؓ کو عزت و حرمت حاصل نہ ہو بلکہ اس سے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت و خلافت میں ہم کسی حریف کو برداشت نہیں کر سکتے۔" [1]

یہ باتیں سن کر ابن الحنفیہ نے کہا:۔

"خدا تمہارا بھلا کرے اور حسینؓ پر رحم فرمائے اور ان کے گناہ کو معاف کرے۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ہمارا نقصان تمہارا نقصان اور ہماری محرومی تمہاری محرومی ہے۔ حسینؓ اس بات کے مستحق نہیں کہ تم ان کو برا بھلا کہو اور برملا ان کی مذمت کرو۔ ...... امیر المومنین میں درخواست کرتا ہوں کہ حسینؓ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہیے جو مجھے ناگوار ہو۔"

یزید نے جواب دیا:۔

"میرے چچیرے بھائی! میں حسینؓ کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہوں گا جس سے تمہارا دل دکھے۔"

(انساب الاشراف بلاذری ج ۳)

(خلافت معاویہ و یزید ص ۱۸۱ و ۱۸۲ طبع دوم و ص ۲۰۷ و ۲۰۸ طبع سوم)

مؤلف کی اس نقل سے پتہ چلا کہ یزید کی زندگی کے دو رُخ تھے نجی زندگی میں اس کا برتاؤ کچھ اور تھا اور سب کے سامنے کچھ اور چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ سے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی تھے اس کی نجی گفتگو کا کیا انداز ہے اور ان کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر اپنے کس قدر گہرے افسوس کا اظہار کر رہا ہے لیکن سب کے سامنے اس کا جو طرزِ عمل تھا خود ہی بیان کر دیا ہے کہ

"ہم پبلک میں حسین کی عیب جوئی کرتے ہیں ...... اس سے ہم لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت و خلافت میں ہم کسی حریف کو برداشت نہیں کر سکتے۔"

[1] یہ یزید ہی کی شرافت ہے کہ مرنے کے بعد بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی سے باز نہ آیا حالانکہ قرآن مجید میں اہلِ ایمان کو عیب لگانے کی ممانعت آئی ہے اور حدیث شریف میں مُردوں کو برا کہنے سے منع کیا گیا ہے ہاں اگر کوئی کھلا فاسق ہو اور اس سے دینی ضرر کا اندیشہ ہو تو اور بات ہے۔ تعجب ہے بے لاگ محقق کو یزید کے لعن طعن پر تو بڑا غصہ آیا مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی پر کچھ نہ بولے حالانکہ یزید کا ظلم و فسق متواتر ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا تقویٰ و پرہیزگاری۔

یہ ہے یزید کے سہ سالہ دورِ حکومت کے شاندار کارناموں کی اصلی علت وغایت جو خود مؤلف نے اپنے ممدوح کی زبانی نقل کی ہے سچ ہے "حق برزبان جاری"

مؤلف نے مصعب بن زبیر کے قتل پر مشہور اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کا جو قول نقل کیا ہے وہ بھی اسی ذہنیت کا ترجمان ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"مصعب جب قتل ہوگئے عبدالملک کو اس کا ملال ہوا اور کہا

لقد کان بینی وبین مصعب صحبۃ قدیمۃ — مجھ میں اور مصعب میں پرانی دوستی تھی مجھے وہ سب لوگوں

وکان احب الناس الی ولکن ھذا الملک — سے زیادہ محبوب تھے لیکن سلطنت کی حالت بانجھ عورت

عقیم (ص ۳۱۶ ج ۸ البدایہ والنہایہ) — کی سی ہے اس میں تعلقات کا لحاظ نہیں ہوتا۔"

(ص ۲۲۹ طبع دوم و ص ۳۰۳ طبع سوم)

یزید اور عبدالملک دونوں کے مندرجہ بالا بیانات سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ دونوں اموی خلیفہ اقتدار کے کس قدر بھوکے تھے؟ اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے وہ کسی ناجائز سے ناجائز امر کے ارتکاب سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

مصعب اپنے بڑے بھائی امیر المؤمنین حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عراق کے والی تھے عبدالملک نے جب امیر المؤمنین کے خلاف بغاوت کی تو یہ اس سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے، ان کی زندگی کا یہ واقعہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے جس کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی انصاری چودھری کے متعلق ان کو کچھ شکایت پہنچی اور انہوں نے چاہا کہ اس کو سزا دیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ نے جب ان کو یہ حدیث سنائی کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ

استوصوا بالانصار خیرا اقبلوا من — یاد رکھو انصار کے ساتھ نیک سلوک کرنا ان کے نکوکار

محسنھم وتجاوزوا عن مسیئھم — کی نیکی کو قبول کرنا اور ان کے خطاکار سے درگذر کرنا۔

تو ان کی یہ کیفیت ہوئی کہ بے اختیار اپنے آپ کو تخت سے گرا دیا اور فرش پر اپنا رخسارہ رکھ کر کہا بسَ

عاجزی سے کہنے لگے۔

امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سر
علی الرأس والعین [1] — آنکھوں پر۔

لیکن ان کی شہادت کے بعد جب حجاج ظالم عبدالملک کی طرف سے اسی عراق کا عامل بن کر آیا تو اس نے خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی تذلیل واہانت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی حتیٰ کہ اس ظالم نے ان کے ہاتھ پر مہر کرادی تھی جس میں تحریر تھا عتیق الحجاج [۵۲] (حجاج کا آزاد کردہ غلام) حالانکہ یہ وہی انسؓ ہیں جن کی زبانی حافظ ذہبی نے یہ نقل کیا ہے کہ

خدمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک
عشر سنین فما ضربنی ولا سبنی ولا — خدمت کی سو آپ نے نہ کبھی مجھے مارا نہ برا بھلا کہا
عبس فی وجھی۔ [۵۳] — اور نہ میری کسی بات پر ترش رو ہوئے۔

مولف نے مستشرقین کی زبانی یزید کی جو مدح سرائی کی ہے وہ آپ کی نظر سے گذر چکی اور یزید کی سیرت و کردار کے مذکورۂ بالا واقعات بھی آپ پڑھ چکے جو خود مولف نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں اب خود فیصلہ کر لیجئے کہ مولف اور ان کے بے لاگ محققین کے بیانات میں کس قدر صداقت ہے۔

مورخین کے بیان کردہ دن صحیح ہیں نہ تاریخیں

بے لاگ محقق نے تاریخی واقعات کو علم ریاضی کی روشنی میں بھی جانچا ہے اور مورخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کو جانچنے کے لئے از روئے تقویم و کلیۂ حساب ایک ایسی جدول تیار کی ہے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ

"مندرجہ ذیل جدول پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جائے گا کہ دیگر واقعات تو رہے درکنار خروج کے سلسلہ میں جو جو تاریخیں اور دن کتب تاریخ میں بتصریح ماہ و سال درج ہیں ان میں ایسی ایسی فاحش غلطیاں ہیں کہ نہ کسی تاریخ سے دن کی مطابقت ہوتی ہے اور نہ کسی دن سے تاریخ کی۔ تقویم ہجری و

---

[۵۱] تاریخ الاسلام ذہبی اور البدایہ والنہایہ میں مصعب کا تذکرہ ملاحظہ ہو۔
[۵۲ و ۵۳] تاریخ الاسلام ذہبی، تذکرہ حضرت انس رضی اللہ عنہ

عیسوی نیز کلیۂ حساب کی رو سے راویوں کی بیان کردہ تاریخ کا جو دن آتا ہے آخری خانۂ جدول میں درج ہے اور یہی دن صحیح دن ہے جس کی جانچ بھی کچھ دشوار نہیں۔ مورخ طبری اور دوسرے مورخین نے حسب ذیل الفاظ میں یہ تاریخیں اور دن صراحت سے بیان کئے ہیں:۔

وکان خروج الحسین من مدینة الی مکة یوم	حسینؓ مدینہ سے یک شنبہ کے دن ۲۸ رجب
الاحد لیلتین من رجب سنة ستین ودخل	کو نکل کر مکہ گئے اور جمعہ کی رات میں ۳ شعبان
مکة لیلة الجمعة لثلاث مضین من شعبان	کو مکہ میں داخل ہوئے[1] پھر بقیہ ماہ شعبان
فاقام بمکة بقیة شعبان ورمضان وشوال و	ورمضان وشوال وذی قعدہ مکہ میں
ذی قعدة وخرج من مکة لثمان مضین من	مقیم رہے اور ۸ ذی الحجہ سہ شنبہ کے
ذی الحجة یوم الثلاثاء یوم الترویة (ص ۲۱۵	دن یوم ترویہ کو مکہ سے روانہ ہوئے۔

ج ۶ طبری وص ۱۵۸ ج ۸ البدایہ والنہایہ)

٭

سلہ یہ واضح رہے کہ عام شاہراہ کے اعتبار سے جس پر کارواں چلا کرتے تھے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک دس مرحلے پڑتے ہیں چنانچہ حمد اللہ مستوفی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں:

"از مدینہ تا مکہ دہ مرحلہ" (ص ۱۹۴ طبع بمبئی)

اس اعتبار سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو راستہ میں پورے دس روز لگنے چاہیے تھے حالانکہ ان مورخین کی تصریح کے مطابق وہ پانچ روز ہی میں مکہ معظمہ جا پہنچے کیونکہ یکشنبہ کو مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے اور دوشنبہ سہ شنبہ چہارشنبہ پنجشنبہ سفر میں گذار کر شب جمعہ کو (کہ جس کی صبح کو جمعہ کا دن آنے والا ہے) مکہ معظمہ میں آگئے اور مؤلف کی تقویم کے مطابق بجائے یکشنبہ کے جمعہ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور شب چہارشنبہ کو مکہ معظمہ پہنچے بہرصورت کل پانچ دن میں سفر تمام ہوا لیکن مولف کو جو دقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سفر کربلا میں پیش آئی تھی یہاں بالکل نہ آئی اور انھیں ذرا بھی یہ خدشہ نہ گذرا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تو قاعدہ کے لحاظ سے دس دن راہ میں لگنے تھے پھر وہ ۲۸ رجب کو چل کر بجائے ۸ شعبان کو پہنچنے کے ۳ شعبان کو خلاف قاعدہ مکہ معظمہ میں پانچ دن پہلے کیسے پہنچے اور دس مرحلے پانچ یوم میں کیونکر طے ہو گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کربلا کے سفر میں مؤلف کو یہ فکر ہے کہ کہیں ۱۰ تاریخ سے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہاں نہ پہنچ جائیں ورنہ ان کے ممدوح عمر بن سعد اور ابن زیاد کے مظالم کا پردہ چاک ہو جانے کا ڈر ہے اور کاروان اہل بیت پر پانی کی بندش کا انکار مشکل ہو جائے گا لیکن مکہ معظمہ میں اگر کاروان حضرت حسین رضی اللہ عنہ پانچ دن پہلے پہنچ جائے تو کچھ حرج نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قیام کی مدت (باقی بر صفحہ آئندہ)

ناسخ التواریخ کے مؤلف بھی یہی کچھ لکھتے ہیں:۔

"حسین علیہ السلام یک شنبہ بست و ہشتم رجب از مدینہ ۔ ۔ ۔ بیرون شد و روز جمعہ سیم شعبان وارد مکہ گشت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوم ترویہ کہ روز سہ شنبہ ہشتم ذی الحجہ بود از مکہ آہنگ عراق نمود ہماں روز کہ مسلم بن زیاد بیرون آمد روز دیگر کہ یوم عرفہ بود شہید گشت (ص ۲۰۷ ج ۶ از کتاب دوم مطبوعہ ایران)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) جتنی زیادہ ثابت ہو سکے اتنا ہی اچھا تاکہ مؤلف کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ

"مکہ میں حضرت حسین رضؓ چار مہینے سے زیادہ عرصے تک مقیم رہے اور اس تمام مدت میں عراقیوں کی تحریرات اور ان کے وفود آتے جاتے رہے خروج کی تیاریاں ہوتی رہیں لیکن حکومت کی جانب سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا" (ص ۷۳ طبع دوم و ص ۹۲ طبع سوم)

جملہ مورخین متفق البیان ہیں کہ "حضرت حسین پورے چار مہینے اور چند دن مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے" یعنی ماہ شعبان و رمضان و شوال و ذیقعدہ نیز ماہ ذی الحجہ کے چند ابتدائی ایام۔ اور اس تمام عرصے میں کوفیوں کے صد ہا خطوط، بیسیوں وفود اور سیکڑوں اشخاص عراق سے ان کے پاس آتے جاتے اور بیعت اطاعت کے حلف اٹھاتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان تمام حالات سے حکومت پوری طرح باخبر تھی بایں ہمہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی" (ص ۱۱۴ و ۱۱۵ طبع دوم و ص ۱۳۶ طبع سوم)

یہ واضح رہے کہ مؤلف کے نزدیک کوفہ کی جانب

"حضرت حسینؓ کی روانگی ۱۰ ذی الحجہ بعد ادائے فریضہ حج ہوئی تھی"۔ (ص ۱۳۰ طبع دوم و ص ۱۵۳ طبع سوم)

۱۰ شعبان سے ۱۰ ذی الحجہ تک پورے چار ماہ ہوتے ہیں اور خود ان کی تصریح کے مطابق

"حضرت حسین رضی اللہ عنہ پورے چار ماہ اور چند دن مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے"

اس لئے یقیناً وہ ۱۰ شعبان سے چند روز پہلے مکہ معظمہ میں پہنچ گئے تھے۔ لہٰذا مؤلف کو جب یہ تسلیم ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی مسافت جو حسب معمول دس دن میں طے ہونا چاہئے تھی چند دن پہلے ہی طے کر لی تھی تو پھر انھیں کربلا کے سفر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے چند روز پہلے وہاں جا پہنچنے سے کیوں انکار ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ کوئی حاجی ذی الحجہ کی ۱۰ تاریخ کو مکہ معظمہ سے کیونکر روانہ ہو سکتا ہے جب کہ اس کو ایام تشریق منیٰ میں گزارنے ہیں اور رمی جمار کرنا ہے یعنی کنکریاں مارنی ہیں۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہوئی جیسے کوئی یوں کہنے لگے کہ فلاں نمازی جمعہ کی نماز سے بغیر سلام پھیرے چلا بنا تو اس میں مؤلف معذور ہیں کیونکہ انھوں نے نہ کبھی حج کیا نہ کسی حاجی سے حج کی تفصیل پوچھی، پھر یہ مسئلہ مسائل کے بکھیڑے ہیں جن میں پڑنا ایک پابند صوم و صلوٰۃ ملا کا کام ہے اور مؤلف تو بلند پایہ تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔

پھر ورودِ کربلا کی تاریخ ۲ محرم بتلاتے ہوئے ص ۲۲۵ پر لکھتے ہیں کہ "ایں واقعہ در روز پنجشنبہ دوم شہر محرم الحرام بود" مورخ طبری بھی حضرت حسین کے قریۂ العقر میں وارد ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ثم نزل (ای العقر) وذلک یوم الخمیس و هو الیوم الثانی من المحرم سنۃ ۶۱ (ص ۲۳۲ ج ۶ طبری) پھر (العقر) کے مقام پر اتر پڑے اور یہ دن پنجشنبہ کا تھا اور محرم سنہ ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی۔

مورخین کی مندرجہ بالا تصریحات (تاریخ و دن) کا جب موازنہ جدول کے آخری خانہ کے مندرجات سے کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ راویوں کے بیان کئے ہوئے دن اور تاریخیں اس درجہ مختلف و متضاد ہیں کہ کسی طرح لائق وثوق و قابلِ یقین نہیں، بلکہ اس شبہ میں قوت پیدا کرنے کا موجب ہیں کہ اس واقعہ حزن انگیز کے اتنی زیادہ برس کی مدت منقضی ہونے کے بعد وضعی روایتوں کے ساتھ ساتھ یہ دن اور تاریخیں بھی وضع ہوئے ورنہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ واقفانِ حال غلط تاریخیں اور دن بیان کرتے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی راوی کا نہ کوئی چشم دید واقعہ ہے اور نہ راویوں میں سے کوئی حسینی قافلہ میں موجود تھا[1]۔ مولف مجاہدِ اعظم[2] کو اعتراف ہے کہ "مردانِ اہلِ بیت" سے کوئی واقعہ مروی نہیں۔ "سید الساجدین بحالتِ بیماری میں خیمے کے اندر تھے، حسن مثنیٰ یا وہ لوگ جو درجۂ شہادت پر فائز نہ ہوئے ان سے کوئی واقعہ مروی نہیں۔۔۔ جس شخص نے جیسا سنا دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے بیان کر دیا۔ بیانِ واقعات میں کسی راوی سے سہو ہوا کسی کے طرزِ بیان نے واقعہ کی اصلیت کو افراط و تفریط سے مسخ کر دیا۔" (ص ۱۴۹) سچ ہے حق بزبان جاری۔

[1] لیکن مولف اور ان کے پیشرو مستشرقین شاید اس وقت کربلا میں موجود تھے جو اپنے چشم دید واقعہ کے طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ حسین اور ان کے مٹھی بھر متبعین نے اپنے بڑے جاطا قتور فوجی دستہ پر جو اُن سے ہتھیار رکھوا لینے کو بھیجا گیا تھا غیر مآل اندیشانہ طور سے حملہ کر دیا" (خلافت معاویہ و یزید ص ۲۱۲ طبع دوم و ص ۲۵۹ طبع سوم)

[2] "مولف مجاہدِ اعظم" شاکر حسین نقوی امروہوی کے متعلق مولف کو اقرار ہے کہ وہ شیعہ ہیں۔ (ص ۸ عرضِ مولف طبع سوم و ص ۲۲۵ طبع سوم)

[3] "یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے" سے یہاں تک طبع سوم میں اضافہ کیا گیا ہے۔

جدول تاریخ ودن

تاریخیں اور دن جو مورخین نے ابومخنف کی روایت سے بیان کی ہیں ۔						صحیح دن ازروئے تقویم وکلیہ حساب اور عیسوی سنہ وتاریخ وماہ سے تطابق	
نمبر شمار	تفصیل واقعہ	سنہ	تاریخ وماہ	دن	صحیح یا غلط		
۱	مدینہ سے مکہ کو روانگی	سنہ ۶۰ھ	۲۸ رجب	یکشنبہ	غلط	جمعہ	۴ مئی سنہ ۶۸۰ء
۲	مکہ میں آمد	״	۳ شعبان	جمعہ	״	چہارشنبہ	۹ ״
۳	مسلم کا حملہ گورنر کوفہ پر	״	۸ ذی الحجہ	سہ شنبہ	״	یکشنبہ	۹ ستمبر
۴	مسلم کا قتل ہونا	״	۹ ״ ״	چہارشنبہ	״	دوشنبہ	۱۰ ״ ״
۵	مکہ سے عراق کو روانگی	״	۸ ״ ״	سہ شنبہ	״	یکشنبہ	۹ ״ ״
۶	لشکر کربلا پہنچنے کی وضعی تاریخ	سنہ ۶۱ھ	۲ محرم	پنجشنبہ	״	سہ شنبہ	۲ اکتوبر سنہ ۶۸۰ء
۷	حادثہ کربلا	״	۱۰ محرم	جمعہ	״	چہارشنبہ	۱۰ ״ ״

کسی ایک دن یا تاریخ کے بیان کرنے میں سہواً غلطی ہوجاتی تب بھی تاویل کی گنجائش ممکن نہ تھی لیکن یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ ساتوں تاریخیں اور دن جو راویوں کے بیان کردہ ہیں باہم مطابق نہیں، نہ تاریخ دن سے اور نہ دن تاریخ سے حالانکہ یہ سب دن اور تاریخیں حضرت حسین رضؓ کے اقدام خروج کے ایسے اہم اور ناقابل فراموش دن اور تاریخیں ہیں کہ کمزور سے کمزور یادداشت کا کوئی راوی بھی خواہ اس کا اپنا چشم دید واقعہ بھی نہ ہوتا لیکن اس نے کسی ایسے شخص کی زبانی یہ حالات سنے اور معلوم کیے ہوتے جسے ان کا ذاتی علم تھا تب بھی وہ ایسی فاحش غلطیوں اور غلط بیانیوں کا ہرگز ارتکاب نہیں کرسکتا تھا۔

جب دن اور تاریخیں تک بھی صحیح صحیح بیان نہ ہوئی ہوں تو دوسرے تمام حالات اور واقعات جو بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے راویوں نے بیان کیے ہیں جن سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں وہ

کیونکر قابلِ وثوق دلائل یقین ہوسکتے ہیں۔" (ص ۱۹۱ تا ۱۹۴ طبع دوم وص ۲۳۲ تا ۲۳۶ طبع سوم)

مؤلف کا یہ سارا غرہ اس وجہ سے ہے کہ خوش قسمتی سے انھیں اردو زبان میں ایک ایسی تقویم مل گئی جس سے ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت معلوم ہوسکے اور یہ تقویم چونکہ ایک "جرمن مستشرق" کی تیار کردہ تقویم کی مدد سے مرتب کی گئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ جنابِ مولف کو جو مستشرقین کی عظمت وصداقت کے نقیب ہیں اسے بعینہٖ من وعن تسلیم کرنے میں کیا شک وشبہ ہوسکتا تھا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"راقم الحروف کے پیشِ نظر انجمن ترقی اردو (ہند۔ دہلی) کی شائع کردہ تقویم ہجری وعیسوی مطبوعہ ۱۹۳۹ء ہے جو ابو النصر محمد خالدی ایم اے (عثمانیہ) نے ایک جرمن مستشرق ایڈورڈ ماسلے کی تقویم کی مدد سے مرتب کی تھی، یہ بڑی کارآمد وسستی تقویم ہے۔" (ص ۱۹۱ طبع دوم وص ۲۳۳ طبع سوم)

مؤلف کو یہ تقویم کیا ملی گویا چودہ طبق روشن ہوگئے اور مورخین کی ساری غلط بیانیاں عیاں ہوگئیں اس لئے بار بار کتبِ تقویم کی اہمیت جتاتے چلے جاتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"موجودہ زمانہ میں ایسی جنتریاں اور کتبِ تقویم ہر شخص کو بآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں جن کی مدد سے سنہ ہجری سے موجودہ سالِ ہجری تک کی اس قسم کی صحیح معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں کہ کس سنہ کے کس مہینہ کی کس تاریخ کو کون دن تھا۔ اس پر آئندہ صفحات میں راویوں کی غلط بیانیوں کے سلسلہ میں تفصیلی بحث آتی ہے۔" (ص ۱۵۹ طبع دوم وص ۱۸۳ طبع سوم)

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

"موجودہ زمانے میں ایسی کتبِ تقویم اور جنتریاں موجود ہیں اور بآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں جن کی مدد سے صحیح طور سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس سنہ کے کس مہینے کی کس تاریخ کو کون سا دن تھا۔ آئندہ اوراق میں ابو مخنف کی اس قسم کی غلط بیانیوں کے سلسلے میں تفصیلی بحث آتی ہے جس میں ایسا فارمولا بھی پیش ہوگا جس سے ہر شخص خود حساب لگا کر یہ معلومات حاصل کرسکتا ہے۔"

(ص ۱۶۱ طبع دوم وص ۱۸۵ طبع سوم)

اب قبل اس کے کہ مؤلف کے بیان کردہ فارمولے اور تقویم کی رو سے مورخین کے بیان کردہ دن اور

تاریخوں کی صحت پر بحث کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو سابق میں علم ریاضی سے جو تعلق رہ چکا ہے اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالدی جائے تاکہ ناظرین کو ان کی خوش فہمی کا اندازہ ہوسکے، مؤلف نے اپنی تالیف تذکرۃ الکرام یعنی تاریخ امروہہ جلد ثانی کے خاتمہ پر "راقم الحروف بندہ محمود" کے عنوان سے اپنے ذاتی حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس میں ایک موقع پر ان کے قلم سے یہ الفاظ بھی نکل گئے ہیں :-

"ریاضی سے طبیعت کو مناسبت نہ تھی اس لئے یونی ورسٹی کے امتحانات میں بار بار ناکام رہا۔"

(ص ۲۷۵ طبع محبوب المطابع، دہلی)

یہ ریاضی ہی کی جھنجھٹ تھی کہ جس کی بدولت جناب مؤلف کو "گریجویٹ" ہونا نصیب نہ ہوسکا۔ چنانچہ سید طفیل احمد صاحب آنریری جائنٹ سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے الفاظ ہیں :-

"مولوی محمود احمد صاحب گریجویٹ نہیں ہیں۔" (تاریخ امروہہ ج ۲ ص ۳۸۴)

مؤلف کی ریاضی دانی کے بعض نادر نمونے اس کتاب میں بھی آگئے ہیں جو ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل ہیں۔

(۱) مؤلف نے مکہ معظمہ سے لیکر کربلا تک کی منزلوں اور ان کے باہمی فاصلوں کی ایک جدول تیار کی ہے اور کل فاصلہ مکہ معظمہ سے کربلا کا ۸۰۰ عربی میل لکھا ہے[۱]۔ حالانکہ خود بدولت نے فاصلوں کی جو تفصیل دی ہے اس کو جمع کیا جائے تو کل ۹۲۳ میل ہوتے ہیں[۲]، یہ جمع کی غلطی ہے اور چونکہ سیکڑوں کا

[۱] حالانکہ ابراہیم رفعت پاشا کے مشہور سفرنامے مرآۃ الحرمین میں درر الفرائد کے حوالے سے جدول المسافات بین مکۃ و امہات المدن الاسلامیۃ (مکہ معظمہ اور مرکزی اسلامی شہروں کے درمیانی فاصلوں کی جدول) میں مکہ معظمہ سے کوفہ کا فاصلہ کل ۵۱۰ میل مرقوم ہے — [۲] پھر لطف یہ ہے کہ مولف نے جلدی میں خود مکہ معظمہ کو بھی جہاں سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سفر کی ابتدا ہوتی ہے ایک منزل شمار کیا ہے اور اس طرح بستان ابن عامر کو جو مکہ معظمہ سے چوبیس[۲۴] میل پر پہلی منزل ہے دوسری منزل قرار دیا ہے اور اسی بنا پر اس کو بجائے ایک دن میں طے کرانے کے دو دن میں طے کرایا ہے یہ اس جدول کی پہلی غلطی ہے۔ مؤلف نے اس جدول میں مکہ معظمہ سے کربلا تک اکتیس منزلیں شمار کی ہیں اور لکھا ہے کہ

"مستند کتب بلدان و جغرافیہ، سفرناموں نیز قدیم و جدید نقشوں میں یہی منزلیں اور فاصلے ان تمام تصریحات کے ساتھ درج ہیں۔" (ص ۱۴۹ و ۱۵۰ طبع دوم، ص ۱۷۳ طبع سوم)۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

حساب تھا اس لئے ریاضی سے مؤلف کی عدمِ مناسبت کو دیکھتے ہوئے اگر ناظرین کرام ان کو فی الجملہ معذور سمجھیں تو بہتر ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) اس سلسلہ میں مؤلف نے حسب ذیل کتابوں کے نام بھی دیئے ہیں:-

(۱) کتاب البلدان یعقوبی۔ (۲) نزہۃ القلوب از حمد اللہ مستوفی (۳) کتاب الخراج از قدامہ بن جعفر (۴) رحلہ ابن بطوطہ، مشہور مستشرق گب کے انگریزی ترجمہ اور نوٹس کے ساتھ (۵) معجم البلدان از یاقوت حموی۔

ہمیں اس جدول پر تفصیلی بحث تو اس وقت مقصود نہیں وہ تو انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی سرِدست صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ یعقوبی کی کتاب میں تو ان منزلوں کی باہمی مسافت کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور نزہۃ القلوب میں نجف سے لیکر مکہ معظمہ تک کل ستائیس مرحلے بتائے ہیں اور نجف سے کوفہ کا فاصلہ کل دو فرسنگ یعنی چھ میل لکھا ہے (ملاحظہ ہو نزہۃ القلوب ص ۱۹۳ طبع بمبئی) لیکن مؤلف کی جدول میں ستائیسویں منزل مغیثہ ہے جو مکہ معظمہ سے نجف کو جاتے ہوئے اس سے چونتیس ۳۴ میل پہلے ہی آجاتی ہے۔ اور کتاب الخراج میں ان منزلوں کی مسافتِ باہمی کے جو اعداد و شمار لکھے ہیں وہ مؤلف کی تصریحات کے مطابق نہیں۔ رہا ابن بطوطہ تو اس نے کوفہ کا سفر اس راہ سے کیا ہی نہیں جو مؤلف نے اپنی جدول میں لکھا ہے وہ تو مکہ معظمہ سے پہلے مدینہ طیبہ گیا تھا اور پھر وہاں سے نجف و کربلا، پھر ان کتابوں میں جدول کی اٹھائیسویں منزل سے لیکر اکتیسویں منزل تک کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور معجم البلدان میں اتفاقی طور پر کسی کسی منزل کی بعدِ مسافت کا بیان آیا ہے مگر وہ بھی مؤلف کی بیان کردہ مسافت سے بعض جگہ بالکل مختلف ہے مثلاً مؤلف کی جدول میں سلیلہ کا فاصلہ ربذہ سے پچاس میل بنتا ہے لیکن یاقوت کی تصریح ہے کہ

من الربذۃ الیہا ستۃ وعشرون میلاً — ربذہ سے لے کر سلیلہ تک ۲۶ میل ہیں۔

اسی طرح معجم البلدان میں مغیثہ اور قادسیہ کا باہمی فاصلہ چوبیس ۲۴ میل لکھا ہے مگر مؤلف نے اسے کھینچ تان کر چونتیس ۳۴ میل بنا دیا ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ ایک طرف تو بے لاگ تحقیق یہ بتاتی ہے کہ

"حسینی قافلہ کا موقعہ واردات پر توقع سے ایک دن پہلے بھی پہنچ جانا بعدِ مسافت اور متوازی مراحل کی تعداد کے اعتبار سے جب محال تھا ممکن الوقوع نہ تھا تو منعِ آب اور وحشیانہ مظالم کی یہ سب روایتیں ہباءً منثوراً ہو جاتی ہیں۔ تارِ عنکبوت کی سی سکت بھی ان میں باقی نہیں رہتی۔"

(ص ۲۰۸ طبع دوم و ص ۲۵۵ طبع سوم)

لیکن دوسری طرف اس کا یہ انکشاف ہے کہ

"حضرت حسینؓ اور ابن سعدؓ کے مابین تین چار ملاقاتیں ہوئیں انھما کانا التقیا مراراً ثلاثا او اربعا حسین وعمر بن سعد (ص ۲۳۵ ج ۶ طبری)

ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں اس خط کا ابن زیاد کے پاس بھیجا جانا بتایا گیا ہے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

(۲) لطف یہ ہے کہ کبھی مؤلف سے اکائیوں اور دہائیوں کے جمع کرنے میں بھی غلطی ہوجاتی ہے مثلاً ارشاد ہے :-

"حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت دس اور گیارہ برس کے درمیان تھی یعنی سِنِ تمیز میں شرف صحابیت حاصل تھا" (ص ۱۴۳ طبع دوم و ص ۱۶۷ طبع سوم)۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) جس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے :-

فان اللہ قد اطفأ النائرۃ وجمع الکلمۃ واصلح امر الامۃ (ص ۲۳۵ ایضاً) — خدا نے آتش (اختلاف) کو بجھا دیا اتحاد و اتفاق پیدا کر دیا اور امت کی اس سے بہتری چاہی۔

اس کے بعد وہ تین شرطیں بھی لکھیں جو مورخین نے نقل کی ہیں گذشتہ اوراق میں جن کا ذکر آچکا ہے۔ راویوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ خط پڑھ کر ابن زیاد کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے :-

ھذا کتاب رجل ناصح لامیرہ ومشفق علی قومہ نعم قد قبلت (ص ۲۳۶ ج ۶ طبری) — یہ خط ایک ایسے شخص نے لکھا ہے جو اپنے امیر کا صحیح مشیر کار اور اپنی قوم کا مشفق ہے ہاں تو میں نے قبول کیا۔

(ص ۲۰۸ و ۲۰۹ طبع دوم و ص ۲۵۵ و ۲۵۶ طبع سوم)

"عمر بن سعدؓ کی ملاقاتوں کے نتیجہ میں حضرت حسین رضہ جب آمادہ ہوگئے کہ امیر المومنین سے بیعت کرلیں ان سے مطالبہ ہوا کہ دمشق تشریف لے جانے سے پہلے ہی ان کے نمائندے کے ہاتھ پر یہیں بیعت کریں" (ص ۲۱۰ طبع دوم و ص ۲۵۸ طبع سوم)

یہ امر ابن زیاد کا جواب وصول ہونے پر کیا گیا تھا اور اس کے جواب میں بقول مؤلف

"فوجی دستے کے سپاہیوں پر عاقبت نا اندیشانہ اچانک قاتلانہ حملہ کردینے سے یہ واقعہ حزن انگیز بجائے اور غیر متوقع پیش آکر گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ختم ہوگیا تھا۔ (ص ۲۲۳ طبع دوم و ص ۲۷۴ طبع سوم)۔

یہ سب نزول کربلا کی سرگذشت ہے لیکن یہاں مؤلف کو کوفہ سے کربلا کا فاصلہ بالکل یاد نہ آیا جو حسب تصریح حمداللہ مستوفی چوبیس میل ہے (ملاحظہ ہو نزہۃ القلوب ص ۱۴۴) اس حساب سے قاصد کو کوفہ جانے اور وہاں سے جواب لانے میں کم از کم اڑتالیس میل کا فاصلہ ضرور طے کرنا پڑے گا ورنہ قصر حکومت سے لے کر فوجی کیمپ تک دو چار میل کا مزید فاصلہ اور بھی ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اب خود فرمائیے یہ واقعہ حزن انگیز تو خیر بقول مؤلف گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ختم ہوگیا مگر پھر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ابن سعد کے مابین تین چار ملاقاتوں میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا۔ اور ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں ابن زیاد کے پاس خط کا بھیجا جانا اور قاصد کا کوفہ آنا جانا اور اڑتالیس میل کا فاصلہ طے کرلینا آخر اس میں کتنی دیر لگی ہوگی؟ اور جب بے لاگ محقق کے نزدیک ایک دن میں یہ سب کچھ ہونا ممکن ہے تو کاروانِ اہل بیت کے لئے ایک دن میں دو منزل طے کرلینا کیوں ممکن نہیں۔

حضرت موصوف کی عمر وفاتِ نبویؐ کے وقت دس اور گیارہ برس کے درمیان کس حساب سے ہوئی اس کی تفصیل مؤلف نے اس طرح بیان کی ہے:۔

"حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کی ولادت ملک حبشہ میں اس وقت ہوئی تھی جب ان کے والدین ابتدائے بعثت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں مکے سے وہاں ہجرت کر گئے تھے"۔ (ص ۴۳ اطبع دوم وص ۱۶۶ طبع سوم)

گویا ابتدائے بعثتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آپ کی وفات تک مؤلف نے حساب لگایا تو کل دس گیارہ برس کے درمیان کا عرصہ نکلا۔ حالانکہ ہر ادنیٰ مسلمان جانتا ہے کہ ابتدائے بعثت سے لے کر وفاتِ نبویؐ تک ۲۳ سال کی مدت ہوتی ہے ۱۳ سال ہجرت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ معظمہ میں قیام رہا اور دس سال ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں۔ لیکن مؤلف کو ریاضی اور تاریخ دونوں میں ایسا ملکہ ہے کہ اس کی بدولت یہ مدت گھٹ گھٹا کر کل دس اور گیارہ سال کے درمیان ہی رہ گئی۔

(۳) اب تفریق کا نمونہ ملاحظہ ہو جو صرف اکائیوں پر مشتمل ہے۔ ابھی آپ مؤلف کے یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں کہ

"حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت دس اور گیارہ برس کے درمیان تھی"۔

اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بابت ان کی یہ تصریح ہے کہ

"ان حقائق کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت حسینؓ تو جیسا ذکر ہو چکا ہے سن و سال میں حضرت ابن جعفرؓ سے کئی سال چھوٹے مثل برادرِ خورد کے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً پانچ برس کی عمر تھی"۔ (ص ۱۳۶ طبع دوم وص ۱۶۹ طبع سوم)

مؤلف کے ان دونوں بیانات سے ہر پڑھا لکھا شخص بھی نہایت آسانی سے سمجھ جائے گا کہ ان دونوں حضرات کی عمروں میں پانچ چھ برس کا فرق تھا۔ لیکن بے لاگ ریسرچ اسکالر کو ریاضی سے جو طبعی مناسبت ہے اس کی بنا پر پانچ کو دس میں سے منہا کرنے کے بعد بھی دس ہی بچتے ہیں چنانچہ ان کے حساب سے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے پانچ چھ برس بڑے ہونے کی بجائے نو دس برس بڑے ٹھہرتے ہیں ارشاد ہے:۔

"اس وقت حضرت حسینؓ کے قریب ترین بزرگوں میں دو ہمنام حضرات زندہ تھے یعنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن جعفر طیارؓ ...... یہ دونوں بزرگ سن و سال میں حضرت حسین رضؓ سے نو دس برس بڑے تھے۔" (ص ۹۸ طبع دوم و ص ۱۱۸ و ۱۱۹ طبع سوم)

یہ تفریق کا ایسا نادر نمونہ ہے کہ اس کے آگے ریاضی کے سارے فارمولے گرد ہیں۔

(۴) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر کے متعلق ایک تحقیق تو مؤلف کی یہ ہے جو ابھی آپ کی نظر سے گذری کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ برس کی تھی تن کتاب میں متعدد جگہ مؤلف نے اسی بات کو دہرایا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"یہ چھوٹے نواسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت پانچ ساڑھے پانچ برس کے اتنے صغیر السن اور کم عمر تھے کہ ان کو اپنے مقدس اور ہادی برحق نانا کے حالات و معمولات کی کوئی بات

سلہ اب تک تو یہی سنتے چلے آئے تھے کہ "بزرگی بعقل است نہ بسال" مگر اب معلوم ہوا کہ بے لاگ تحقیق میں یہ بات بھی صحیح نہیں بلکہ اصل بزرگی سن و سال کے اعتبار سے ہے لہذا جس کی عمر بڑی وہی بزرگ اور اسی لیے مؤلف حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بزرگ سمجھتے ہیں مؤلف کی اس ریسرچ پر ہمیں ان کے حسب حال ایک واقعہ یاد آگیا جس کا ذکر مورخین نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

وقد یروی عن ابن عباس انہ امسک للحسن والحسین رضی اللہ عنہما رکابیہما حین خرجا من عندہ فقال لہ بعض من حضر أتمسک لھذین الحدثین رکابیہما وانت اسن منہما فقال لہ اسکت یا جاھل لا یعرف الفضل لاھل الفضل الا ذووا الفضل۔

(تاریخ بغداد از خطیب بغدادی، نزہۃ الالبا از ابن الانباری اور تاریخ ابن خلکان میں فراء نحوی کا تذکرہ ملاحظہ ہو)

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما ان کے پاس سے اٹھ کر تشریف لے جانے لگے تو حضرت موصوف نے (آگے بڑھ کر) ان دونوں بزرگوں کی رکابیں تھام لیں، اس پر حاضرین میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ آپ ان نوعمروں کی رکابیں تھامے کھڑے ہیں حالانکہ آپ سن و سال میں ان سے بڑے ہیں۔ (یہ سن کر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے ڈانٹا کہ اے جاہل زبان بند کر، بڑوں کی بڑائی بڑے ہی جانتے ہیں۔

یاد تھی نہ زبانِ مبارک سے سنا ہوا اسلامی سیاست کے بارے میں آپ کا کوئی ارشاد"[۵] (ص ۹۹ طبع دوم

(ص ۱۲۰ طبع سوم)

اور دوسرے موقع پر فرماتے ہیں :-

○ اہلِ علم جانتے ہیں کہ حضرت حسین رض کی عمر وفاتِ نبوی کے وقت پانچ برس کے قریب تھی (ص ۳۴ طبع دوم و ص ۴۵ طبع سوم)

---

[۵] کیسی اچھوتی ہے یہ تحقیق اور کتنا نادر ہے یہ انکشاف، سچ فرمایا جناب مؤلف نے

"تیرہ سو سال کی طویل مدت میں کسی مورخ اور مصنف نے ان تاریخی واقعات کے بارے میں جن پر صدیوں سے وضعی روایتوں، من گھڑت حکایتوں اور افسانوں کے گہرے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس نوعیت سے تحقیق و ریسرچ کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔" (ص ۷ عرض مؤلف طبع سوم)

تحقیق کی ندرت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اس تبصرہ کا پس منظر سامنے ہو۔ سنئیے بے لاگ محقق فرماتے ہیں :-

"ابن عباس رض اہلِ بیت نبوی صلعم کے اکابر میں سے تھے اور ان سب میں تفاسیر قرآن کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ایسے ذی مرتبت واعلم واعقل اہلِ بیت بزرگ نے جو متفق علیہ خلیفۂ وقت کی بیعت میں خود بھی بطیبِ خاطر داخل تھے اور دوسروں کو بھی جماعت سے وابستگی کی اور تفرقہ سے محترز رہنے کی ہدایت فرماتے "اولوالامر" کی اطاعت اور اس کے خلاف خروج کے جواز و عدم جواز کے بارے میں احکام شریعت حضرت حسین رض کو یقیناً اسی طرح بتائے اور سمجھائے جس طرح دوسروں کو بتاتے اور سمجھاتے تھے۔ کیونکہ یہ چھوٹے نواسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت پانچ ساڑھے پانچ برس کے اتنے صغیر السن اور کم عمر تھے کہ ان کو اپنے مقدس اور ہادی برحق نانا کے نہ حالات و معمولات کی کوئی بات یاد تھی نہ زبان مبارک سے سنا ہوا اسلامی سیاست کے بارے میں آپ کا کوئی ارشاد۔ حضرت ابن عباس نے جو گفتگوئیں ان سے کیں، جماعت سے وابستگی اور تفرقہ سے اجتناب پر جو نصیحتیں فرمائیں ان کے بعض فقرات غالی راویوں کی روایتوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔" (ص ۹۹ طبع دوم و ص ۱۲۰ طبع سوم)

یہ ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی علمی پوزیشن مؤلف کی نظر میں کہ حضرت ممدوح کی عمر کا آخری سال ہے۔ اور بقول ان کے "متفق علیہ خلیفہ" کے خلاف خروج کا ارادہ رکھتے ہیں مگر دینی معلومات کا یہ حال ہے کہ "ان کو اپنے مقدس اور ہادی برحق نانا کے نہ حالات و معمولات کی کوئی بات یاد تھی، نہ زبانِ مبارک سے سنا ہوا اسلامی سیاست کے بارے میں آپ کا کوئی ارشاد" لیکن اپنے ممدوح کے بارے میں بے لاگ تحقیق کا یہ فیصلہ ہے :-

"امیر یزید رح کبار تابعین میں تھے، اپنے محترم والد ماجد کے علاوہ بعض اجلہ صحابہ سے فیض صحبت اٹھایا یعنی حضرت دحیہ الکلبی رض سے جو جلیل القدر صحابی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر بھی رہ چکے تھے

(باقی برصفحۂ آئندہ)

۵

بقیہ مضمون حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیے گا انشاء اللہ تعالیٰ